مفکرِ عصر، ادیبِ زماں، اُستاذِ دوراں، آتالیقِ وقت، عندلیب دار العلوم

حضرت مولانا نورِ عالم خلیل امینی رحمہ اللہ

اُستاذِ ادبِ عربی و رئیس تحریر "الداعی"، دار العلوم دیوبند

۱۳۷۲ھ — ۱۹۵۲ء ... ۱۴۴۲ھ — ۲۰۲۱ء

ذوقِ خامہ
محمد فہیم الدین بجنوری
خادم تدریس دار العلوم دیوبند

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

نورِ درخشاں

مفکّرِ عصر، ادیبِ زماں، اُستاذِ دوراں، آتالیقِ وقت، عندلیب دارالعلوم

حضرت مولانا نورِ عالم خلیل امینی رحمہ اللہ

اُستاذِ ادبِ عربی و رئیس تحریر "الداعی"، دارالعلوم دیوبند

۱۳۷۲ھ — ۱۹۵۲ء ۔ ۱۴۴۲ھ — ۲۰۲۱ء

ذوقِ خامہ

محمد فہیم الدین بجنوری

خادم تدریس دارالعلوم دیوبند

ناشر

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

تفصیلات

نام کتاب : نورِ درخشاں

تالیف : محمد فہیم الدین بجنوری (استاذ دار العلوم دیوبند)

اشاعت : ربیع الاوّل ۱۴۴۳ھ- اکتوبر ۲۰۲۱ء

تعداد : گیارہ سو

ناشر : مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

فہرست

پیش رُخ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیاً أما بعد:

گذشتہ رمضان، کورونا کی دوسری لہر کے شباب میں گذرا، موت کا رقص ملک گیر تھا، ''ننھے انجان جرثومے'' نے، ہر بستی کو، گوشہء عافیت سے محروم کر دیا تھا، زندگی اور موت شانہ بہ شانہ چل رہی تھی، اس سیلابِ حوادث میں، علمی دنیا کی زیست بھی داؤ پر لگی، دارالعلوم دیوبند کے متعدد روشن چراغ، اسی طوفان کی نذر ہوئے، ہوش ربا لہروں نے، ہم سے کئی رواں دواں زریں عہد چھین لیے۔

استاذ گرامی، حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی علیہ الرحمہ کا سانحہء وفات بھی، اسی ہمہ ہمی میں پیش آیا؛ گو کہ وہ صحت کے عوارض سے دو چار تھے؛ لیکن ان کی مخصوص وضع اور زندہ دلی، امیدوں کا سرچشمہ فراہم کرتی تھی؛ یہی وجہ ہے کہ علالت کی خبروں کے ماحول میں بھی، ان کی وفات صاعقہ اثر ثابت ہوئی اور ہر ایک نے ناگہانی حادثے کا احساس کیا۔

حیات مستعار کی چند ساعتوں کو، حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ کی قیمتی یادوں سے، معطر کرنے کے لیے، عاجز نے، تاثرات کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا، جس کے تحت تیرہ قسطیں مرتب ہوئیں، اب خیال آیا کہ ان کو ایک مجموعے کی شکل میں عام کر دیا جائے۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ زیر بحث کاوش، سوانح کی تعبیر سے کہیں فروتر ہے، یہ مجرد تاثرات ہیں، جن میں شخصیت کے عناصر کی نسبت، سیر حاصل گفتگو کی امید، امر زائد ہے،

حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ کے کمالات کا حق ادا کرنے کے لیے، ایک مستقل اور مبسوط سوانح درکار ہے۔

بل کہ تاثرات کی رو میں بھی، بعض پہلو تشنہ رہ گئے ہیں، مزید بعض اہم گوشے ذہن میں تھے؛ لیکن وقت گذرتا جا رہا ہے اور عدیم الفرصتی شباب پر ہے، سر دست ایضاح البخاری، جلد نمبر گیارہ کی تکمیل کا داعیہ، کسی بھی دیگر قلمی سرگرمی کا متحمل نہیں، یوں ذہن میں آیا کہ ان اوراق پراگندہ کی ترتیب کو، مزید زیر التوا رکھنا مناسب نہیں، جو مضامین تیار ہیں، ان کا ''اون لائن'' نسخہ شائع کر دیا جائے اور فرصت میسر ہونے پر، اضافہ شدہ نسخہ ''اون لینڈ'' شائع کیا جائے۔

اللہ تعالی، اس کاوش کو، شرفِ قبولیت بخشے، حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس عطا فرمائے، مقربین خاص میں شامل فرمائے، باقیات کو صدقۂ جاریہ بنائے، آمین۔

محمد فہیم الدین بجنوری قاسمی
خادم تدریس دار العلوم دیوبند
۲؍محرم الحرام ۱۴۴۳ھ ۱۲؍اگست ۲۰۲۱ء

آغازِ سخن

سدا رکھتا ہوں شوق اس کے سخن کا
ہمیشہ تشنہ ءِ آبِ بقا ہوں
(ولی)

حامدًا و مصلیًا أما بعد:

استاذِ گرامی، حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی علیہ الرحمہ، تکمیل ادب میں، فقط ایک گھنٹہ رو بہ رو ہوتے تھے؛ لیکن ذہنوں میں چوبیس گھنٹے رہتے تھے، ساعتِ ششم کا تصور اعصاب پر صبح سے حاوی ہوجاتا تھا، طبیعت میں سحر کاری و جادوگری جو تھی! آپ عہدِ ثانی کی ان چنیدہ اور کلیدی شخصیات میں ہیں، جنھوں نے دار العلوم کی فضاؤں کو اپنا رنگ وآہنگ دیا، جن کے طبع زاد اوراق نے، یہاں کے عندلیبوں، گلوں اور لالہ ہائے گل زار کو، نئے زاویے سے فیض یاب کیا، وہ مدرس نہیں نقاش تھے، اسیرانِ نو، دل کے ہارنے کا خوش گوار تجربہ، روزِ اول کرتے تھے، اولین صحبت میں قلوب کی جو تختیاں، ان کے اختیار میں آتی تھیں، ان پر تصرف میں وہ سال بھر، ہر طرح آزاد ہوتے تھے۔

آپ کے تیار کردہ جام وسبو اور شیشہ وساغر کا ذکر نہ چھیڑ اے ہم نشیں! اُس بزم میں، زبان وسخن کی داستان تھی اور اس کی نت نئی انگڑائیاں بھی، ادب تھا اور اس کی نزاکتیں بھی، فکر وشعور کے جلوے تھے اور تخلیق وفن کی رعنائیاں بھی، علم وآگہی کے حسین نظارے تھے اور طلب وجستجو کے ذوق کی ضمانتیں بھی، عشقِ اکابر کی آتش فروزاں کرنے والی انگیٹھی کے لیے بھی، وقت اور دن کی کوئی قید وبندش نہیں تھی، حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور دیگر

بزرگوں کا، رس گھولنے والا ذکر، کسی بھی دن دراز ہوجاتا تھا، غرض! اُس ''دوکان'' میں آخر کیا نہیں تھا! لیکن آج صد حیف کہ:

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل
وہ دوکان اپنی بڑھا گئے

طیبہ کی مئے مرغوب اور ہندوستان کا سفال وظرف

فخر زبان وادب، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے کہا تھا:

''اس دنیا میں ہر شخص، کسی نہ کسی تصویر میں، اپنا خدا دریافت کر ہی لیتا ہے، بابائے اردو، مولوی عبدالحق کو، اردو زبان کی صورت میں خدامل گیا ہے۔''

مولوی عبدالحق کو اردو زبان کے ساتھ جو عشق وجنون تھا؛ یہ اس کی بھرپور تمثیل ہے، استاذِ گرامی حضرت مولانا نورعالم خلیل امینی علیہ الرحمہ سے منسوب، ''کارزارِ حیات'' ہمیں یہ باور کراتا ہے کہ انھوں نے بھی کسی حال ووجد میں، عربی زبان کی جاں نثاری وفداکاری کا حلف اٹھالیا تھا اور پھر اپنے استاذِ خاص، حضرت مولانا وحیدالزماں علیہ الرحمہ کے دست مبارک پر کیے گئے، اس عہد وپیمان کو، جہانِ آب وگل سے عالم جاوید تک نبھایا۔

حضرت مولانا علیہ الرحمہ کو سفالِ ہندی پر حد درجہ اصرار تھا، اس اصرار کی بنیادیں دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا وحیدالزماں کے ساتھ اتاہ عشق میں تھیں، آپ نے سعودی عرب میں، عربی زبان کا ایک مختصر المیعاد کورس کیا تھا، جب آپ کی عربیت کے کوکبہ ءجلال نے، عالم عرب کو خیرہ کیا، تو نسبت کے تئیں فکر دامن گیر ہوئی، آپ اس تصور سے ملول ہوجاتے کہ ان کے فن پاروں کو، مذکورہ کورس کا احسان مند گردانا جائے گا، جو کہ ان کے نزدیک، دارالعلوم دیوبند اور مولانا وحیدالزماں علیہ الرحمہ کے فیوض والطاف سے سخت بے رخی وناسپاسی تھی، مجھے یاد نہیں ہے کہ اس باب کی صفائی، میں نے آپ سے کتنی بار سنی ہے، اس سیاق میں آپ پرجوش ہوجاتے تھے، رگیں پھول جاتی تھیں اور آواز بلند ہوجاتی تھی، پھر غیرت آپ کو یہ کہنے پر مجبور کرتی تھی کہ میرے پاس جو کچھ ہے، دارالعلوم کی دین ہے، مجھے جو کچھ ملا ہے، حضرت مولانا وحیدالزماں سے ملا ہے اور بس!۔

خِرَد وآگہی کے مضر اثرات

خِرَد کا زہر، عدم! موت ہے جوانی کی
وہ خوش نصیب ہے جو مردِ ہوش مند نہیں
(عبدالحمید عدم)

علمی وفکری کامیابیوں کا خون بہا، ہمیشہ مہنگا رہا ہے؛ بل کہ بیشتر جان لیوا بھی؛ آپ اس شوق کو دھیمے زہر سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، تکمیل ادب کے شب وروز کی ہمہ ہمی کے بعد، سن ۲۰۰۰ء میں تخصص فی الادب کی تقریب سے، بندہ حضرت الاستاذ مولانا نور عالم خلیل امینی علیہ الرحمہ کے نزدیک آیا، پچاس کے لپیٹ سے باہر نہیں تھے؛ لیکن عوارضِ صحت، آپ کے عزائم اور خاکوں میں مزاحم ہو چکے تھے، ہم نے پہلی بار شگر کے عارضے کو نزدیک سے دیکھا اور سمجھا، جو پہلے ہی آپ کی صحت وتوانائی کے ساتھ، ہلاکت خیز مفاہمت کر چکا تھی۔

لسانِ نبوت سے کیا بات نکلی ہے کہ ''علم کا شیدائی سیراب نہیں ہوتا'' (ترمذی، حاکم)!، متنبی نے عاشق کی نفسیات خوب سمجھا ہے:

العشق كالمعشوق يعذب قربه
للمبتلى وينال من حوبائه

عشق واقع میں جاں گسل ہے، تو ہوا کرے! عاشق کے ذوق میں، وہ ہزار قند ہے، نیز دیسی محاورہ یوں ہے:

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے بیٹے سے دوا لیتے ہیں

میں نے وہ آنکھیں دیکھیں، جن کی روشنی، علم کی راہ نوردی کے نام ہو چکی تھی، گہرے چشمے سے جھانکتی ہوئی آنکھوں میں، کتب بینی اور مطالعے کے بے رحم ردِعمل کی شکایتیں عیاں تھیں، وہ اعصاب دیکھے، جن کو فکری معرکہ آرائی نے ماندہ کر دیا تھا، بالیقین لرزتی ہوئی انگلیوں نے، رعشہ آشنا ہونے سے قبل، تخلیق وفن کا دراز تر سفر طے کیا تھا۔

شمع علم کے پروانوں کی روایات کو آپ نے تسلسل دیا، لطفِ زندگی سے سمجھوتہ کیا اور

خونِ جگر کو علم و فکر کے گلزاروں کی آب یاری کے لیے بچا کر رکھا، بامرادی کی اس کلید کا ادراک، آپ کو عنفوانِ شباب سے تھا؛ تازہ جواہر پاروں کی نسبت کچھ کہنا، تو یقینا مدحِ آفتاب ہے؛ تاہم حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ کے پچاس سالہ قدیم مضامین بھی میری نظر سے گذرے ہیں، وہی جلوہ، وہی رعنائی، وہی حسن، وہی دادِ زبان و سخن اور فکر و فن!

حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی دو ذاتی لائبریریاں تھیں، فارسی خانے سے متصل دار جدید کے گوشے والا حصہ کافی کشادہ تھا، کچن کے علاوہ بھی اس میں دو بڑے کمرے تھے، کتابوں سے مملو یہ کمرے آپ کے ذوق مطالعہ کے گواہ تھے؛ لیکن یہ وسیع رقبہ بھی آپ کے ذخیرۂ کتب کے لیے کوتاہ دامنی کا شاکی تھا؛ اس لیے آپ نے خصوصی گزارش کے ذریعے، دولت کدے کے اوپر ایک وسیع کمرہ تعمیر کرایا، جو کتابوں کی کان بنا، مجھے ان دونوں لائبریریوں کی خدمت کا موقع ملا، وہاں موجود کتابیں آپ کی شخصیت کے گونا گوں شاندار گوشوں کے تئیں چشم کشاں تھیں، ان کتب خانوں کے مشمولات میں، اس رائے عامہ کی پیہم تغلیط تھی کہ حضرت صرف ادیب اور زبان داں ہیں۔

فن بلاغت میں دسترخوان کی صفائی، بخل کی عمدہ تمثیل مانی گئی ہے، بخیل کا دسترخوان میلا کیوں کر ہوسکتا ہے، جب استعمال کی نوبت ہی نہیں آتی، بندے نے کتابوں کو بھی اسی زاویے سے دیکھا ہے، الماریوں میں قرینے سے سجی ہوئی کتابیں، بہتوں کے یہاں دیکھیں؛ لیکن ہم اس وقت تک سیر چشم نہیں ہوتے؛ جب تک کتابوں کا انبوہ، نشستِ مطالعہ پر بالیدہ و پراگندہ نہ ہو، ہمارا یہ ذہن حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ کی مطالعہ گاہ نے بنایا ہے، آپ کے بیرونی کمرے میں، کتابوں کا بے ترتیب پھیلاؤ، کسی وارد و صادر کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

منفرد طریق کشید اور اس کی افادیت پر ایمانِ راسخ

ہم نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے
(فیض احمد فیض)

آپ کے محبوب استاذ، وحید العصر، حضرت مولانا وحید الزماں علیہ الرحمہ، بابِ تعلیم

میں کیفیت کے قائل تھے، کمیت کا درجہ ان کے نزدیک ثانوی تھا، زبان ولغت کے گونا گوں روابط سے، انھوں نے یہ کشید کیا تھا کہ لفظ ہو یا تعبیر، اس کا مجرد مواجہہ کوئی شے نہیں ہے؛ ایسی شاہانہ سیر کے ساتھ، جملہ عربی دفاتر بھی آپ کو کچھ نہیں دے سکتے؛ اس کے برخلاف آپ ایک لفظ سے ملیں؛ مگر اس پر خیمہ زن ہو جائیں، یہ ہزار قراءتوں سے افضل، مؤثر، مفید اور نتیجہ خیز ہے۔

حضرت الاستاذ، مولانا نور عالم خلیل امینی علیہ الرحمہ نے ہمیں بتایا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں، اسباق کے انبار نہیں تھے، ان کے ذوق میں **"ماجد حضر في الفصل"** ایک یوم کے سبق کی طرف سے کفایت کرسکتا تھا، ان کے نزدیک یہ ایک جملہ مکمل عربی زبان کی تعلیم کا سفیر تھا، معلم کو یقیناً تفہیم سے فارغ ہونا ہے؛ لیکن متعلم اس نوع کا کوئی خیال ہرگز نہ پالے، یہاں سے اسی کے حصے کا کردار شروع ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر **"ماجد"** کی تبدیلی میں، آپ اپنے حافظے سے کتنے اسما فراہم کرسکتے ہیں؟ **"حضر "** کی جگہ افعال کی کتنی شکلیں، صیغیں اور گردانیں استعمال کرسکتے ہیں؟ **"الفصل"** کے متبادل کے طور پر، کائنات کی کتنی چیزوں کو آپ ظرف بنا سکتے ہیں؟ پھر اس جملے سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے، آپ کے پاس توانائی کتنی ہے؟ نیز اس قواعد کے لیے، اپنی حیاتِ عزیز سے، کتنی ساعتیں، پہر اور ایام مستعار لے سکتں ہیں؟ ان سوالوں کے جواب طے کریں گے کہ عربی زبان سیکھنے کی راہ میں، کامیابی کے کتنے مدارج، آپ کا مقدر بن سکتے ہیں۔

حضرت الاستاذ خود بھی نہج وطریق کے بادشاہ تھے، اس میں ان کے اپنے اضافے ہیں، دل چسپ بھی اور البیلے بھی، ان کے یہاں الفاظ اور تعبیرات سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے، "پوسٹ مارٹم" کا لفظ خوب آتا تھا، وہ کہتے تھے کہ ہماری گھڑیوں میں بارہ گھنٹے ہوتے ہیں، ریلوے میں چوبیس، تم اپنی مشق میں اڑتالیس گھنٹے بجاؤ، لفظ وتعبیر میں تصرف کرتے جاؤ؛ تا آں کہ وہ دست بستہ طالبِ پناہ ہو اور آپ کی کتاب کا جز بننے پر شرم سار وغم خوار! اس مشغلے کو نشست وبرخواست اور آمد ورفت کا ایسا جز بناؤ کہ دیکھنے والوں کو خلل داغ کا

گمان ہو۔

کسی مناسبت سے پر جوش ہو گئے اور کہنے لگے کہ فہیم! اگر آج بھی تم کوئی نئی تعبیر بتاؤ گے کہ تو میں اس کو تمرین کے بغیر جانے نہیں دوں گا، سر دست جملے بناؤں گا، میں نے ان کو تعبیرات دہراتے و گنگناتے ہوئے بارہا دیکھا، اس نکتے پر وہ بہت حساس تھے، تکمیل ادب میں تاکید تھی کہ مستقل تمرین کے علاوہ، جدید تعبیرات پر ہر طالب علم اپنے تئیں مشق کرتا رہے، کبھی اتفاقیہ جانچ بھی ہوگی اور پھر ایک دن اس کا بھی آ گیا، حضرت نے آزاد تمرین کی کاپیاں طلب کر لیں، ظاہر کہ طلبہ اس کو ضابطے سے خارج سمجھے ہوئے تھے، اکثر کوتاہ نکلے، وہ جلال کا دن تھا، سب کی کاپیاں چاک ہوئیں، گویا میں بیس سال بعد ابھی دیکھ رہا ہوں کہ وہ بر بنائے ضعفِ دست، مشقت سے کاپیاں پھاڑ رہے ہیں! چالیس پچاس کاپیوں کے معاً چاک ہونے سے، درس گاہ اوراق سے بھر گئی؛ اوراق کا تماشا اس لیے بھی پھیلا کہ حضرت کے یہاں تمام کاپیاں دراز اور دبیز درکار تھیں، اس دن جو چند کاپیاں دست برد سے محفوظ رہیں، ان میں ایک کاپی بندے سے منسوب تھی۔

اپنے استاذ کے طریقِ تدریس کے حوالے سے، وہ مسلکِ توحید رکھتے تھے، اس کی افادیت ان کے یہاں ایمان کی طرح راسخ تھی، اس کے امتیاز کو ظاہر کرنے کے لیے فرماتے تھے کہ اگر وقت کا شیخ الحدیث بھی، عربی سیکھنے کے لیے آئے گا، تو اس کے لیے بھی یہی واحد راستہ ہے، اس کو بھی ''حضر ماجد في الفصل'' سے اسی طرح الجھنا ہے، اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔

طبع زاد لطائف کا چشمۂ شیریں

لبوں پر تبسم، تو آنکھوں میں آنسو، تھی دھوپ اک پل، تو اک پل میں بارش
ہمیں یاد ہے باتوں باتوں میں ان کا، ہنسانا رلانا، رلانا ہنسانا

اکبر حیدر آبادی

بے شک تدریس، ایک سنجیدہ پیشہ ہے؛ لیکن دراز نفس سنجیدگی، گرانی کا موجب ہے، طبیعت پژمردہ ہو جاتی ہے اور اخذ و استفادے کے لیے درکار، انبساط و انشراح باقی نہیں

رہتا؛ کام یاب تدریس کے لیے، صورتِ دل گیر اور شگفتہ تصویر؛ دونوں یکساں طور پر مطلوب ہیں، ہم نے یہ دو متضاد جوہر، اپنی کامل شکل میں، دو اساتذہ کے یہاں جلوہ گر دیکھے، امام التدریس حضرت مفتی سعید احمد پالن پوری علیہ الرحمہ، ماحول کو ہمہ تن جستجو، سنجیدہ اور متفکر رکھتے تھے؛ پھر اسی لمحہ خوراک تبدیل کرتے اور اپنے آزاد لطائف سے، فضا کو زعفران زار کر دیتے تھے، اس فن کاری کے دوسرے بادشاہ، حضرت الاستاذ مولانا نور عالم خلیل امینی علیہ الرحمہ تھے، اس سلسلے میں، حضرت ادیبِ زماں کو، اول الذکر سے یہ امتیاز حاصل تھا کہ آپ کے بیشتر لطائف خانہ زاد تھے، گویا اس باب میں بھی، ان کی تخلیق خو طبیعت کو، چراغِ دیگر، مستعار لینے میں ابا تھا۔

امامِ ادب وسخن کی درس گاہ، متانت وسنجیدگی کی مثال تھی، تلامذہ حددرجہ مرعوب وخائف رہتے تھے، پیاس کی مد میں، میز پر رکھا بھاری بھرکم گلاس، تنبیہ الغافلین بننے کا امکان، ہمہ وقت رکھتا تھا، وقفے وقفے سے اس کی تصریح، خطرے کو یقینی بناتی تھی؛ گو کہ اس نے واقعے کی شکل اختیار کبھی نہیں کی، پھر یہ ماتم کدہ، اگلی ہی ساعت، بزم آرائی کا منظر بھی پیش کرتا تھا، کوئی خارجی لطیفہ فراہم نہ ہوتا، تو حاضرین میں سے کسی کے کوائف، سامانِ شگفتگی پیدا کرتے۔

کاہل اور بے ہنگم ساخت کے طلبہ کا مستقبل ان کو اہتمام میں نظر آتا تھا، ''لاعلاج مریضوں'' کی تشخیص میں فرماتے کہ انھوں نے کچھ نہ سیکھنے کا حلف اٹھایا ہے، ان کے احوال کی ترجمانی میں یہ دو عہد و پیمان دہراتے تھے: ''ہم کورے آئے تھے اور کورے ہی واپس ہوں گے''، نیز: ''ہے کوئی مائی کا لال جو ہمیں ایک حرف بھی سکھا دے؟''۔

چھوٹی اور دبلی کاپیوں کے لیے، ان کے یہاں ''زیر جامہ لباس'' کی تعبیر تھی، خراب خط کا نام ''کیڑن مکوڑن'' رکھا تھا، کبھی نام کی ایجاد کا اختیار بھی دیتے تھے، فرماتے: جب اتنا بُرا لکھا ہے، تو اس کا نام بھی تجویز کرو، غیر معیاری مدارس، ''صفر سرمایہ کاری کارخانے'' کے زمرے میں تھے، جن میں ثمر آوری یقینی اور خسارہ ناممکن، مزاح سے مغلوب ہوتے، تو اپنے علاقے کی تہذیب کو بھی لیتے، اپنے ہم وطن طالب علم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، مجھ سے گویا ہوئے کہ ان کے یہاں بھینس بھی ''آتے ہیں''، میرے وطن بجنور کو کوفہ قرار دیا

تھا، مجھے چھیڑنے کے لیے، دوسرے حاضرین کو میرے وطنی انتساب پر متنبہ کرتے، ایک علاقے کی نفسیات کے حوالے سے فرمایا کہ ان کو نوکری اور ملازمت چاہیے، خواہ جہنم کی ہو۔

میں ایک سنجیدہ مزاج، ذی علم، دینی شخصیت کے ساتھ حاضر ہوا، جن کے علمی و دینی مقام کے حضرت خود بھی بہت قائل تھے، اتفاق کی بات کہ ان کا جسم بھی بھاری تھا اور ان کے دو دیگر تلامذہ بھی کھاتے پیتے تھے، اِدھر میرا وزن بھی سوا ہے، گویا حیات بخش موضوع ہم رشتہ تھا؛ چناں چہ ملاقات کا اصل موضوع جو کہ نہایت اہم تھا، پس منظر میں چلا گیا اور حضرت نے منظر نامے کے ساتھ دل بھر کر شوخی کی۔

تلاوتِ قرآن کے بڑھتے ہوئے شغف میں، جنت کے اُس پار نکلنے کا امکان، جوان کو دریافت ہوا تھا، وہ احاطہ دارالعلوم کو ایک عرصے سے گل زار کیے ہوئے ہے، تیز رفتار بائک والے کی نسبت، ان کو دنیا کے آخر تک نکل جانے کا گمان ہوتا تھا، رجسٹر حاضری کی غیر معیاری تحریر میں، اردو شرح کے مواقع تلاش کرتے تھے، نورانی قاعدے میں اردو شرح کی ضرورت کو اجاگر کرتے ہوئے، نام بھی منتخب فرمایا تھا: ''روحانی فائدہ شرح اردو نورانی قاعدہ''، شرح نویسی کے محرک اعذار سے متعلق، جھوٹی داستان کی چٹکی لیتے ہوئے فرماتے کہ آں موصوف کی زحمتِ قلم نے، ایک خلق کو، ناحق مرنے سے بچا لیا۔

واقعہ یہ ہے کہ پُرمزاح فقروں، شوخ تعبیروں، ذومعنی الفاظ، چبھتے ہوئے تبصروں، ظریفانہ القاب اور مزاحیہ مصوری کے وہ بادشاہ تھے، اس داستان کو جتنا طول دیا جائے کم ہے؛ لیکن بندے کو اپنے فہم و ادراک کی نسبت جتنی خوش گمانی ہے، حافظے کے حوالے سے اتنی ہی بد ظنی اور مایوسی ہے؛ اس لیے ناچار قلم کو روکتا ہوں: {**لعل اللہ یحدث بعد ذلک أمراً**}۔

شمعِ بزمِ متنبی

سنتا ہے جو تمھیں، نہ سنے ہے کسی کو وہ
کیا جانے کیا سکھاؤ ہو، تم کیا پڑھاؤ ہو
(کلیم عاجز)

عربوں کے سب سے بڑے شاعر، ابوطیب متنبی کا دیوان، شعری ادب کا بے نظیر

ذخیرہ اور منظوم آثار کا بیش قیمت اثاثہ ہے، جو صدیوں سے اہل ذوق کے دلوں پر حکمرانی کر رہا ہے، ابن جنی، واحدی اور عکبری جیسے ائمہء شعر وسخن نے، اس دیوان کی خدمت کو اپنا سرمایہ افتخار سمجھا؛ بل کہ اول الذکر کو، خود متنبی نے اپنے اشعار کا عارف اور محرم اسرار قرار دیا، کوئی طالب رجوع ہوتا، تو متنبی، ابن جنی کا حوالہ دے کر کہتا کہ وہ میرے اشعار کو مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔

کہنے کو برصغیر کے بیشتر دینی مدارس نے، اپنے عربی نصاب میں متنبی کے لیے جگہ نکالی ہے؛ لیکن از ہر ہند میں اس کی تدریس کو نئے معانی ملے، ہماری طالب علمی میں سالِ ششم کی تین درس گاہیں تھیں، متنبی کا جام تین صحبتوں کو لطف ونشاط بخشتا تھا اور اس کے تینوں ساقی ومرشد نابغہء روزگار تھے؛ بل کہ ہنگامہء گیرودار کے کیف وسرور میں، تینوں ہستیوں کو اندازہ نہیں ہوا کہ ان کی داستانِ حیات نے، وسطی با سے الف اور وسطی الف سے علیا کے مدارج طے کر لیے ہیں اور اب وہ امامِ ادب وسخن، مفکر عصر حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی، یا استاذ الاساتذہ، حضرت مولانا عبدالخالق مدراسی، نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند، یا جانشینِ اکابر، حضرت مولانا عبدالخالق سنبھلی، نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند ہو چکے ہیں۔

متنبی کے ساغر و پیمانے کا یہ سنہرا دور، دراز تر ثابت ہوا، جس کا دورانیہ چار دہائیوں پر مشتمل ہے، مادرِ علمی کے نظامِ تعلیم میں، وقفے وقفے سے ابھرنے والی، تبدیلیءمذاق کی لہریں بھی، اس تسلسل میں مزاحم نہ ہو سکیں، اُس وقت تین بزم تھیں؛ درس کے بنیادی تقاضوں میں آسودگی کے تئیں وہ یک رنگ تھیں؛ لیکن اضافی خصوصیات، اس کہکشاں میں تنوع پیدا کرتی تھیں، عربیت میں تعمق وتدقیق کا رجحان، شاعرانہ ذوقِ لطیف کی تعمیر، جمالیاتی مزاج وحس کی دریافت؛ یہ وہ سہ رخہ تنوع تھا، جو تینوں بزموں کو جداگانہ خدوخال سے روشناس کرتا تھا۔

نوآسیر اور نوعمر طالبِ علم، ایسا طالع آزما نہیں ہو سکتا کہ انتظامیہ کی جانب سے طے شدہ نظام میں کوئی تجربہ کرے، مقامی اداروں سے دیوبند کا رخ کرنے والے، جدید طلبہ کا پہلا سال مرعوبیت کی نذر ہوتا ہے؛ بنابریں ۱۹۹۷ء کا سال، ششم ثالثہ تک محدود رہا اور

حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ سے رسمی یا غیر رسمی استفادے کی نوبت نہیں آئی؛ لیکن دو سال قبل، جب ششم رابعہ میں دیوان متنبی کی تدریس تفویض ہوئی، تو حضرت کے درس کی بعض قدیم کاپیوں کے توسط سے، دیوان متنبی میں بھی شاگردی کی سعادت سے بہرہ ور ہوا۔

دیوان متنبی کی تدریس میں چار چیزیں بنیادی ہیں: لغات، نحوی ترکیب، ترجمہ اور مطلب، محققین کی دریافت میں، اس کی عربی شروحات پچاس سے متجاوز ہیں، جن میں عکبری، واحدی اور برقوقی کی شروحات عمدہ ہیں؛ لیکن حل کتاب کا زاویہ عربوں اور عجمیوں کے یہاں یکساں نہیں ہے، وہ بیشتر مفردات کو بدیہی جان کر نظر انداز کریں گے؛ جب کہ آپ کے ماحول میں وہ بحث طلب ہیں، مفصل ترکیب، جس کو زنجیری ترکیب سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے اور جس میں بہ قول حضرت الاستاذ: خاندان بندی کا اہتمام ہوتا ہے؛ اس کا تصور عرب شارحین کے یہاں نہیں ہے، اردو ترجمے کا تو سوال ہی کیا! مطلب اور تشریح میں بھی وہ بہت انتخاب کرتے ہیں؛ نیز مقصود کی نشاندہی میں اغلاط بھی ہیں؛ بل کہ متنبی نے ابن جنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، طنز ملیح کے طور پر کہا تھا: ''یہ میرے اشعار کے معانی بیان کرتے ہیں، وہ معانی بھی جو جو میری مراد ہوتے ہی اور وہ بھی جو میرے پیش نظر کبھی نہیں رہے۔''

یہ تو مستند عربی شروح کے مسائل ہیں؛ اردو شروح کے بارے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے، اعادے کی حاجت نہیں؛ ایسی صورت حال میں، بندے کو حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ کے درسی امالی سے، غیر معمولی تعاون اور رہ نمائی ملی۔

حضرت کے یہاں لغات کی تحقیق کا اپنا انداز ہے، جس میں وہ نئے لفظ کو مختلف زاویے سے کھولتے ہیں؛ تا آں کہ جدت اور توحش کے علی الرغم، وہ مانوس اور ذہن نشین ہو جائے، ترکیب کا اہتمام بھی منفرد انداز کا ہے، مشکل تراکیب کی نشاندہی پر اکتفا کرنے کے بجائے، وہ مفصل ترکیب کو ترجیح دیتے ہیں، ترجمے میں ایک سے زائد تعبیرات آزماتے ہیں؛ چوں کہ اردو کے بھی بادشاہ ہیں؛ اس لیے متنوع تعبیرات دست بستہ نظر آتی ہیں، آخر میں تشریح ہوتی ہے، جس میں وہ ہوتے ہیں اور ان کا غیر معمولی رسا ذہن، پھر چوں کہ

اظہار کی صورتیں طبع زاد بھی ہیں اور مملوک بھی؛ لہذا بخل اور تشنہ کامی کے کسی واہمہ کا گذر کیسے ہوسکتا ہے!۔

تحدیث نعمت کے لیے میرے ترکش میں، اس سے بڑا کوئی تیر نہیں کہ ششم ثانیہ کی جس درس گاہ میں، حضرت علوم عربیت کے دریا بہاتے تھے، عین اسی وقت، اسی درس گاہ کے بالائی حصے میں، ششم رابعہ کے طلبہ کو مطمئن وخوش کرنے کے لیے، بندہ مختلف ترکیبیں آزماتا تھا، افسوس کہ اب یہ حسین منظر اور دل فریب احساس اپنے ماضی کو روئے گا:

وہی بزم ہے وہی دھوم ہے، وہی عاشقوں کا ہجوم ہے
ہے کمی تو بس اسی چاند کی، جو تہِ مزار چلا گیا
(نصیر الدین نصیرؔ)

میکدۂ زبان وادب، تکمیلِ ادب، ساعتِ ششم

اس سخن ور سے مجھے فیضِ سخن ہے اے حفیظ!
نامِ نامی ہے گرامی، جس جہاں استاد کا
(حفیظ جالندھری)

درسِ نظامی کا سودا، کل وقتی عہد و پیمان ہے، دن تمام درس گاہ کی نذر، رات تکرار واعادے میں محبوس، ہمارے دور میں طالب علم کو بیرون کی کوئی خبر نہ تھی، یہاں ''قدیم الایام'' کی قید دانستہ ہے؛ کیوں کہ جب سے ''فتنہء دست وجیب'' نے، کچے پکے گھر کو فتح کیا ہے، دانش گاہوں کی روایات بھی بدل گئی ہیں، حالیہ ربع صدی میں، قیامت کی فسوں گری دیکھنے میں آئی ہے، الغرض! اُس وقت کے احوال دیگر تھے، بیشتر طلبہ، درسی سرگرمیوں تک محدود تھے؛ اس میں خارجی مطالعہ کا بھی استثنا نہیں، آپ کو اس عہد کی تصویر دکھانا چاہوں گا۔

ایک طالب علم دورۂ حدیث کے سالانہ امتحان میں اول آیا، تکمیل ادب کی نئی فضا سے تحریک پاکر، اس نے زبان وادب کی کچھ کتابوں کے نام ازبر کیے اور ان کی فراہمی کے لیے، ''دارالکتاب'' کا رخ کیا، وہاں پہنچ کر وہ گویا ہوتا ہے: ''مولانا علی میاں ندوی کی

جہانِ دیدہ دے دؤ'' ،اس بے خبری پر مولانا ندیم الواجدی دامت برکاتہم ،باغ باغ ہو گئے ،پھر انھوں نے میرے ساتھ خوش طبعی کو طول دینے کے لیے، یہ بھی فرمایا کہ اگر جہانِ دیدہ مولانا علی میاں کی ہے،تو یہ آپ کو مفت عنایت ہوگی؛ بعید نہیں کہ یہ تحریر شرفِ ملاحظہ حاصل کرے کہ سوشل میڈیا کا دور ہےاور قرینِ قیاس ہے کہ حکایت ان کے موجودہ حافظے کا حصہ نہیں ہوگی؛ کیوں کہ ان کے سامنے ایک نو وارد تھا؛لیکن میرے لیے یہ لطیفہ حیاتِ ابدی رکھتا ہے؛ کیوں کہ وہ اس وقت بھی حضرت مولانا ندیم الواجدی تھے، ملک کے نامور صاحبِ علم وفکر اور ممتاز قلم کار۔

یہی وہ وقت ہے، جب میں طلبہءبجنور کی لائبریری ''تہذیب الاخلاق'' کے لیے، مولانا وحید الدین خان کی تصانیف کا ایک انبار خرید لایا تھا،صدر منتخب ہونے کے بعد، یہ اولین کارنامہ انجام دیا، انجمن کے نگراں، مخدومِ گرامی، حضرت مولانا محمد سلمان بجنوری، دامت برکاتہم ،استاذ دار العلوم دیو بند کو معلوم ہوا،تو متفکر ہوئے ،طلبہ کے تعاون پر مبنی فنڈ سے،خریداری عمل میں آ چکی تھی، اب ان کے نزدیک واحد راستہ یہی تھا کہ وہ متذکرہ بالا ''سم قاتل''کو، لائبریری سے، اپنے لیے خرید لیں، ظاہر ہے کہ ''منتر سے واقف سپیرے'' کے لیے، زہریلے سانپ میں کوئی خطرہ نہیں؛ جب کہ دوسروں کے لیے، وہ پیامِ موت ہے۔

یہ تصویر آپ کو قائل کرے گی کہ تکمیلِ ادب کے منتہی طلبہ کو، حضرت الاستاذ مولانا نور عالم خلیل امینی علیہ الرحمہ ''زیرِ تعمیر'' نیز ''زیر تعمیر سے بھی نیچے'' جیسے، کم تر خطاب دینے میں حق بجانب تھے، نئی کھیپ سے رابطے کا آغاز، منفی تبصروں سے کرتے تھے، تو اس کی توجیہ، تلخ تجربات کی ایک داستان میں پنہاں تھی، کاروانِ زبان وادب کی بامرادی کے لیے، جس نشانِ قدم کو وہ معیار سمجھتے تھے، اس پر طلبہ کے پورا اترنے کو لے کر، مایوسی ظاہر کرنا بھی، ان کی مجبوری تھی۔

ضابطے میں تکمیل ادب کی تپائی پر ''المختارات العربية'' رکھی ہوتی تھی، جو عربی اخبارات کے اقتباسات کا مجموعہ ہے؛لیکن بنیادی طور پر یہ نثر جدید کا گھنٹہ تھا، معلوم ہے کہ نئے دور میں زبان کا سفر نسبتاً زیادہ تیز گام ہے،صحافتی، معاشرتی اور تہذیبی تحریکوں کے

علاوہ، ٹیکنالوجی کی جادوئی ترقی نے، اس کی رفتار کو بے قابو کر دیا ہے، چشم زدن میں نسلوں کی خلیج کا مسئلہ منھ اٹھا لیتا ہے؛ پھر یہ مجموعہ خود کئی دہائیاں دیکھ چکا تھا؛ اس لیے پڑھاتے ہوئے کسک محسوس کرتے تھے، نئے انتخاب کی آرزو کسی بھی دن الفاظ کا جامہ پہن لیتی تھی، حضرت الاستاذ اگر آمادۂ اقدام ہو جاتے، تو تکمیلِ ادب کے نونہالوں کو زندہ، شاداب، رواں دواں اور سدا جواں چشمہ مل جاتا۔

تاہم کہانی کا دوسرا رخ بھی ہے، مجھے یاد ہے کہ قفس کے بالکل ابتدائی ایام میں، اولین صفحے پر "اجتماع طارئ للأوبك لبحث تهديدات فورد" جیسے متون کی قرأت ہوتی، تو جماعتوں میں ممتاز آنے والے، "مشاہیر" کے چہروں پر ہوائیاں اڑتیں اور ان کی آنکھیں کبڈیاں کھیلتیں، تعبیرات کے توحش اور اجنبیت سے، اس کلام کی یادیں تازہ ہو جاتیں، جس کو بلاغت کے صفحات نے، جنات کے کلام کے طور پر محفوظ کیا ہے، ان نونہالوں کی نفسیاتی کہتری اور زبان کی نئی انگڑائیوں سے بے خبری کو دیکھیں، تو میکدے کو قدیم روایات پر رکھنا بھی خیر سے خالی نہیں؛ چناں چہ حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ نے، متذکرہ بالا خاکے میں رنگ بھرنے سے گریز ہی کیا۔

عربی زبان کی نسبت، قدیم و جدید کی دوئی و تفریق کے مسئلے میں، استاذِ گرامی، حضرت مولانا امینی علیہ الرحمہ، اپنے محبوب استاذ، وحید العصر، حضرت مولانا وحید الزمان علیہ الرحمہ کے مقلدِ محقّق تھے، کہتے ہیں کہ پرانی وضع کے ایک استاذ نے، حضرت مولانا کیرانوی علیہ الرحمہ کی طرف کوئی رقعہ بڑھا کر یہ کہا تھا کہ اس کو عربی میں لکھ دیں، اس فرمائش کے بعد، ایک لاحقہ بھی ہم رشتہ کر دیا تھا کہ قدیم عربی میں تو بندہ خود بھی لکھ لیتا؛ لیکن جدید عربی مطلوب ہے؛ اس لیے آپ سے رجوع ہوا ہوں؛ خلافِ مسلک گفتگو کا تحمل نہ ہوا، ان کو رقعہ واپس کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ قدیم عربی میں لکھ لائیں، میں اس کو جدید عربی میں ڈھال دوں گا۔

حضرت مولانا وحید الزماں علیہ الرحمہ کے موقف کو واضح کرنے والا یہ قصہ، آپ بہت دل چسپی سے سناتے تھے، ادھر دوئی کی مخالفت میں آپ کا بیان بھی زوردار ہوتا تھا؛ لیکن نو

آموز طالب علم کے لیے یہ صورتِ حال عجیب ہوتی، وہ قدیم وجدید کی یکسانیت کو ماننے کے لیے آمادہ کیسے ہوتا؛ جب کہ فرق کھلی آنکھوں نظر آتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قدیم وجدید ادب کے مابین، دو فرق بین ہیں: قدیم ادب میں چوں کہ فنی مقاصد اور تخلیقی جوہر پیش نظر ہوتے تھے؛ اس لیے پرانی ادبیات، قافیوں اور ہم صوتی ٹکڑوں سے مملو ہیں، وہ شاعرانہ مرصع کاریوں اور فسوں گری کو ادب کا جز و لازم سمجھتے تھے، جس کی مثال ہمارے گھر میں مقامات حریری ہے؛ جب کہ جدید دور کے ادب کا رنگ دیگر ہے، گذشتہ ڈیڑھ دو صدی کے ادیبوں نے، زبان و بیان کو روزمرہ کی گفتگو اور عام بول چال والا نہج دیا، واقعیت پسندی، استدلال، صراحت، قطعیت، سادگی و بے ساختگی؛ اس نئے ادب کے خدوخال ہیں، زبان کے نئے معماروں نے، غیر ضروری آرائش اور شاعری کی روایتی پیوند کاری سے، پیہم دوری بنائی۔

ایک نمایاں فرق تو یہ ہوا، دوسری طرف نئے تصورات وافکار سامنے آئے، نیز ایجادات کا ایک سیلاب آیا، جو ہنوز رواں ہے؛ ان ضروریات کے لیے نئے الفاظ و انداز وضع کیے گئے۔

لہٰذا نفس فرق اپنی جگہ؛ لیکن کم ہمت، سہولت پسند ٹولہ، اس کو اپنی کاہلی کا جواز سمجھتا ہے، ان اکابر زبان وادب کے مذکورہ نظریے کی تشریح یہ ہے کہ جدید لفظ کی تولید، قدیم ذخیرے ہی کی احسان مند ہے، "أصاب" اگر جدید تناظر میں، زخمی کرنے اور ہونے کے معنی میں مقبول ہوا، تو اس کی جڑیں قدیم معانی میں ہیں، اگر پرانی لغت میں پہنچنے اور پہنچانے کا مفہوم نہ ہوتا، تو اس سے نئی تعبیر کا دروازہ بھی ہرگز وا نہ ہوتا، ہر دو امام، ہمارے زخموں سے آگاہ تھے، وہ دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے تھے، دورۂ حدیث سے فارغ ہو کر تکمیل ادب میں، قدم رکھنے والوں کا زبانِ حال سے یہ دعوی غلط تھا کہ ان کو قدیم عربی آتی ہے، نئی حاضری جدید عربی کی مد میں ہے، واقعہ یہ ہے کہ ہم وہاں کورے حاضر ہوئے تھے، ہمارا دامن زبان وادب کے قدیم وجدید ہر دو قسم کے پھولوں سے یکساں خالی تھا اور ہمارا یہ اعتراف ہماری نئی تعمیر کی کامیابی کے لیے از حد ضروری تھا۔

عربی زبان وادب کا گل زارِ وحیدی اور اس میں بہارِ امینی

صدقے اس اَبرِ فیض کے جس کی بہار نے

پُر خار وادیوں کا خیاباں بنادیا

برصغیر کے دینی مدارس، اپنے ناموں کے ساتھ ''عربیہ'' کا لاحقہ لازماً لگاتے ہیں، ہمارے مدارس کی عرفی شناخت میں بھی، اس جز کی نمائندگی ہے، اس نظام کو عرفِ عام میں ''عربی تعلیم'' سے بھی یاد کیا جاتا ہے؛ نام کو درکنار کریں، کام کا جائزہ بھی یاد دلاتا ہے کہ ہماری تعلیم کا انحصار عربی زبان پر ہے، قرآن وحدیث ہماری تعلیم کا مرکز ہیں؛ یہ دونوں مصادر اور ان سے پھوٹنے والے جملہ علوم کا پیرہن یہی زبان ہے، ابتدائی درجات کی ایک دو کتابوں کے استثنا کے ساتھ، نصاب بھی عربی ہے؛ لیکن اس ''داستان امتیاز'' کی تلخ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا یہ عربی نصاب، کبھی عربی نظام میں تبدیل نہیں ہوا، مدارس کا ماحول، زبان اور تحریر دونوں میں، عربی قالب سے محرومی وعاجزی کا شاکی رہا، اس باب کے حرفِ شکایت کو، میں علاقائی مدارس اور اپنی طالب علمی کے حوالوں سے دراز تر کرسکتا ہوں؛ لیکن خودام المدارس کے عہدِ زریں کی تفصیلات، کچھ کم چشم کشا نہیں۔

ساٹھ سال قبل کا ایک مکتوب، اس زخم کی حکایت کا بہترین اشاریہ ہے، فروری ۱۹۶۳ء کو، اس وقت کے ناظم تعلیمات، حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ، ضابطے کی ایک تحریر میں، مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت قاری طیب صاحب علیہ الرحمہ سے عرض کرتے ہیں:

''بہ گرامی خدمت حضرت مہتمم صاحب زید مجدہم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

تقسیم اسباق کے اجتماع میں، جس میں احقر اور جناب محترم حضرت مہتمم صاحب اور مولانا سید فخر الحسن صاحب، مولانا بشیر احمد صاحب، مولانا ظہور احمد صاحب شریک ہوئے؛ احقر نے یہ ذکر کیا تھا کہ مجلس شوری میں، اس کا تذکرہ بہت دنوں سے آرہا ہے کہ عربی تقریر وتحریر سے طلبہ عاجز نظر آتے ہیں، مصر سے بھی علما آئے؛ مگر ان کے آنے سے بھی جو ذوق مطلوب تھا، وہ پیدا نہیں ہوا اور جو کچھ کامیابی ہوئی، وہ کوئی

خاص مرتبہ نہیں رکھتی، اس کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ علمائے مصر اردو نہیں جانتے، اس پر غور وفکر کرتے ہوئے، یہ تجویز سامنے آئی کہ مولوی وحیدالزماں کیرانوی، دارالعلوم کے فاضل ہیں اور ان کو عربی کی تحریر وتقریر میں اچھی مہارت ہے، ان کی استعداد پر نظر کرتے ہوئے، مجلس کو یہ امید ہوئی کہ وہ اس سلسلے میں وقیع خدمات انجام دے سکیں گے۔'' (وہ کوہ کن کی بات: ۲۶۲، ۲۶۳)۔

اس مکتوب کا گوشۂ دلالت یہ ہے کہ خود عربی مدارس کے مرکز میں، جدید عربی کی تحریری وتقریری مشق کے تئیں، مزید بہتری کی گنجائش تھی۔

دوسری رائے والوں کی یہ توجیہ بے شک اپنے معانی رکھتی ہے کہ عربی بول چال، ہمارے مدارس کا ہدف نہیں ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ نصب العین کی نسبت، ہمارے مدارس کی تاریخ، علوم دینیہ کے سلسلہ کا، سب سے درخشاں باب ہے، قرآن وسنت کے گہرے ادراک میں، وہ اپنی نظیر خود ہیں، ان کے نکالے ہوئے آب دار موتیوں نے، اِس نبوی پیشین گوئی کو پورا کیا ہے کہ دور افتادہ علاقوں میں، احادیث کا خیر مقدم کرنے والے، ان کے اصل ناقلین وحاملین سے، زیادہ فقیہ وسمجھ دار ہوں گے: ''رب مبلغ أوعی من سامع'' [بخاری: ۱۷۴۱]۔

لیکن یہاں دیگر پہلو بھی ہیں، جن کو متواتر نظر انداز نہیں کر سکتے، ہم نے عرب مصادر پڑھنے پر اکتفا کیا، خداداد فہم کا جادو چلا اور اکابر نے گہرائی میں جا کر نگینوں کو دریافت کیا؛ پھر ان نگینوں کو درس گاہوں میں لٹایا، تلامذہ نہال ہوئے، افادات سینہ بہ سینہ منتقل ہوئے، اردو تعلیقات کے ہم دوش برصغیر میں عام بھی ہوئے؛ لیکن علم کی داد کے جو مراکز ہیں: حجاز، شام، مصر۔۔۔۔۔۔ وہاں خبر تک نہ ہوئی، چند یواقیت جو پہنچے، وہ ''مشتے نمونہ از خروارے'' سے زیادہ نہ تھے؛ عربی اظہار سے نابلدی ہی، اس خسارے کی ذمے دار ہے، جس طرح فہم کا سلیقہ، پیہم فہم سے آتا ہے، اسی طرح تحریری اظہار بھی، قلمی ممارست ہی سے آتا ہے، جس کو عہد بہ عہد نظر انداز کیا گیا۔

عرب کے علمی وفود، سرزمینِ دیوبند کا رخ آج بھی خوب کرتے ہیں، ان کو اکابر کے رو بہ رو کرایا جاتا ہے؛ ان باریابیوں کا عنوان خالصتاً علمی مذاکرہ ہوتا ہے؛ لیکن وہی زبان کی خلیج قیامت ڈھاتی ہے، یہ واقعی کمزور پہلو ہے کہ علمائے دین باہم گفتگو کے لیے، ترجمان کے محتاج ہوں؛ جب کہ مصادر ومراجع یکساں ہیں؛ ایسی صورتِ حال میں، ان مہمانوں کو خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا؛ بل کہ وہ کما حقہ ہماری علمی سند کے بھی قائل نہیں ہو پاتے۔

مجھے وہ منظر کبھی نہیں بھولتا کہ ایک عرب عالم آئے ہوئے تھے، من جملہ علوم کے ان کو ایک خاص فن سے شغف تھا، میں خوشی خوشی مذکورہ فن کی مسلم شخصیت کے حضور لے گیا، راہ میں ان کا زوردار تعارف کرایا، جس کے وہ فی الواقع حق دار ہیں؛ لیکن مجلس بے کیف رہی؛ کیوں کہ ان کو عربی اظہار کا کوئی سابقہ تجربہ نہیں تھا؛ کسی طرح ان کی تصانیف کے حوالوں سے رعب ڈال کر کام نکالا۔

یہ بھی غلط فہمی ہے کہ عربی تقریر وتحریر کا فن، ہمارے نصب العین سے زائد ہے؛ کیوں کہ اس نوع کی مہارت، خود ہماری درسی وتدریسی لیاقتوں میں جلا اور قوت پیدا کرتی ہے، یہ تمرین ومشق، درسِ نظامی کی سرگرمیوں میں اعتماد فراہم کرتی ہے، میں نے فنون کے بعض ائمہ ایسے دیکھے ہیں، جو عربی عبارتیں پڑھنے میں تکلف محسوس کرتے ہیں؛ خواہ وہ عبارتیں ان کے دل چسپی کے موضوع کی ہوں؛ عربی تقریر وتحریر کی تمرین ومشق والوں میں، یہ بے بسی ممکن نہیں۔

اس پس منظر میں ہماری تاریخی تہی دامنی کو دور کرنے، گلشنِ درسِ نظامی کو نئی بہار سے روشناس کرانے، تازہ کرنوں کا چراغ روشن کرنے، خوش گوار انقلاب برپا کرنے، گل زار میں بادِ بہار داخل کرنے اور اس کے گلوں کو عشرت منزل بنانے، مردہ گوشے میں صور پھونکنے؛ غرض! دستورِ میخانہ میں، بنیادی تبدیلی پیدا کرنے کے لیے، جس غیر معمولی، تاریخ ساز، عہد آفریں شخصیت کی ضرورت تھی، وہ دارالعلوم کو، جدید عربی کے ارسطو، وحید العصر، حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی علیہ الرحمہ کی شکل میں ہاتھ آ گئی۔

نیا طرز جنوں

خیرہ کیے دیتا ہے نگاہوں کو چمک کر
ہر ذرہ ہے خورشید کا شاگرد رشید آج

حضرت مولانا وحید الزماں علیہ الرحمہ کا شمار ان ہستیوں میں ہے، جنھوں نے تاریخ کو وجود بخشا، جدید عربی کے گلشن میں، بہارِنو کی تاریخ، اِن کی جدوجہد سے منسوب ہوئی، مادر علمی کے اربابِ انتظام کی قیافہ شناسی کو سلام! ان کے یُمنِ قدم نے چمن کو نہال کر دیا، ان کا جستجو آشنا رسا ذہن، ایک دو خاکوں پر قانع نہیں ہوسکتا تھا، منصوبوں اور خاکوں کا سیل رواں جاری ہوا، درس وتدریس کے لیے عربی صفوف کا اجرا، تحریر کے لیے دیواری پرچے، تقریر کے لے انجمن، غرض! ہر صبح نئی نسیم وصبا اور ہر شام نیا دامن باد، دیکھتے ہی دیکھتے، مادر علمی کی فضا، عربی رنگوں سے جگمگا اٹھی، زمین پہلے ہی زرخیز تھی، آب یاری ہوئی تو خزانے نکل آئے۔

رجال سازی ان کا خاص جوہر تھا، اس باب میں آپ کی کامیابی، تاریخ دیوبند کا درخشاں باب ہے، ہم ۱۹۹۷ء میں دار العلوم آئے، تو مادر علمی کے در ودیوار پر چسپاں ''وہ کوہ کن کی بات'' کے اشتہار کو پڑھنے اور سمجھنے کی، جدوجہد کرنے والوں میں شامل ہوئے، آپ کی رحلت کو دو سال ہو چکے تھے؛ لیکن ''فرہاد'' نے رخت سفر باندھا، تو وہ ''کوہ کنی'' کے مقصد میں سرخ رو ہو چکا تھا، ان سے شرف تلمذ رکھنے والی عنادل، ہر چہار سو چہچہا رہی تھیں، اندرون احاطہ بھی اور بیرون احاطہ بھی، اس مختصر وقفے نے، منظر نامہ تبدیل کر دیا تھا، جو حلقے ہمیں جدید عربی کے عنوان سے طعنہ دیتے تھے، وہ ہمارے خوشہ چیں بن گئے، وحیدی داستان ایسی ہمہ گیر وہمہ جہت تھی کہ معاصر چمن کی قمریاں بھی، ان کے اوراق چرانے اور ان کے گلوں سے، گل چینی کیے بغیر نہ رہ سکیں اور دیکھتے ہی دیکھتے بازی بالکلیہ بدل گئی، لینے والے سینے، دینے والے بن گئے، دفاع کی روایات والے، اقدام کی تاریخ رقم کرنے لگے۔

حسین شباب، عربی زبان وادب کے حوالے سے، جتنے نام سماعت سے ٹکرائے، وہ سب وحیدی گل زار سے منسوب تھے، تدریس، تقریر، تحریر اور دیگر عربی خدمات میں،

آپ کے تلامذہ ہر جگہ جلوے بکھیرنے میں مصروف تھے،عربی زبان وادب کا ہرا تالیق، وحیدی نغموں کا طرب زار تھا،اس نسبت کے تمام راستے،کیرانوی دولت کدے پر منتہی ہوتے تھے،ان کا سحر لاعلاج تھا؛جس نے بادہ پیا،وہ انھیں کا ہوگیا،ان کو دیکھنے والی آنکھیں،پھر کسی سے سیر نہیں ہوئیں،جو آیا کشتی جلا بیٹھا۔

تحریک زبان وادب کا آخری نقیب

عودِ ہندی بن کے پھیلی تیرے نغموں کی صدا
تو ہے شاگرد رشید بلبلِ ہندوستاں

کیرانوی الطاف گو کہ عام تھے؛لیکن بادہ خواروں کے ظرف،وجہِ فرق کا کردار ادا کرتے ہیں،ابرِ کرم ہر جگہ یکساں برستا ہے؛لیکن اجزائے ارض کا فطری تفاوت اپنا کام کرتا ہے،آپ کی صلائے عام پر لبیک کہنے والوں میں،نکتہ دانوں کا منتخب ہجوم تھا؛لیکن اس مے خانے کی جانشینی کا قرعہءفال،استاذِ گرامی،حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی علیہ الرحمہ کے نام نکلا،علم وادب کا جو انقلاب،حضرت کیرانوی علیہ الرحمہ نے متعارف کرایا تھا،اس کی آب یاری کے لیے،مالکِ نون والقلم نے آپ کو منتخب کیا تھا،تخم ریزی استاذ کر گئے تھے،بار آوری کے لیے آپ چنے گئے،کشتیِ سبک رفتار کو،تیز گامی کے لیے،جو موافق ہوا درکار تھی،وہ آپ کے دمِ گرم سے فراہم ہوئی،نئے گل کھلے،زمزمہ خواں بلبلیں تیار ہوئیں،ہر دو نگاہ فیض نے، نسلوں کی کشتِ حرف چمکائی اور پھر انھیں افتادہ زمینوں سے خزانے برآمد ہوئے۔

ہمارے متعدد اکابر اساتذہ،حضرت کیرانوی علیہ الرحمہ کا ذکر آنے پر،گرمیِ جذبات، درون تک محسوس کرتے تھے؛لیکن ایک شخصیت ایسی تھی،جس میں ان کا عکس جمیل بہ چشمِ سر دیکھا جا سکتا تھا،استاذ وشاگرد کے مابین انتقالِ نسبت کا وہ بے نظیر حوالہ تھے،انھوں نے ''وہ کوہ کن کی بات''میں اپنے محسن ومربی کی تصویر اتاری تھی؛لیکن وہ خود اس تصویر کے زیر وبم میں اترے ہوئے تھے،وہ معرکہءاستاذ کے وارث ہوئے،عین وہی شعلہ ان کے آتش دان میں بھی گرم تھا،اس لیے''رَن''شباب آشنا ہوا۔

1999ء میں،تکمیل ادب کی درس گاہ کے ابتدائی شذرات بھی،ہمارے لیے

اولیاتِ حیات ثابت ہوئے تھے، وصلی وقطعی ہمزوں کے مختلف آداب، یائے مقروءہ وغیر مقروءہ کے احکام، لئے اور لیے، کیلیے اور کے لیے، انھیں اور انہیں، تمھارے اور تمہارے وغیرہ وغیرہ وغیرہ؛ غرض! نئی روشنی کی کرنوں کا ایک سلسلہ تھا، جو اس وقت بالکل نیا اور غیر مانوس تھا؛ لیکن آج مدرسہ مدرسہ، زبان وادب کی ان زیبائشوں سے آراستہ ہے، دورافتادہ علاقوں کے چھوٹے مدرسوں میں بھی، ان گلوں کی خوش بو پہنچ چکی ہے، بلاشبہ علم وزبان کی یہ سوغات آپ کی رہین احسان ہے۔

مرکزی ساقی کو قریہ قریہ جانے کی ضرورت نہیں ہوتی، حق شناس بادہ خوار، ترجمانی میں کفایت کرتے ہیں، گل چیں، کمالاتِ چمن کے بہترین سفیر ہوتے ہیں، تکمیل ادب کی درس گاہ میں، آپ درس نہیں دیتے تھے، کلیجہ نکال کر رکھ دیتے تھے، یہاں آپ نے نسلوں کی آب یاری کی ہے، آج مدارس میں جدید عربی کی جو بہار ہے، ادب کے شعبے قائم ہیں، اردو انجمنوں کے جلو میں، عربی بزم بھی سجی ہیں، تحریر وتقریر کی مشق وقواعد کا ماحول گرم ہے، عربی انجمنوں کے کلیدی پروگراموں کی سرپرستی کے لیے، مادر علمی سے اساتذہ کو مدعو کیا جارہا ہے، معتبر اداروں میں، تکمیل ادب کے فضلاء کی طلب کا، غیر معمولی رجحان ہے، غرض! عربی زبان وادب کی جو لہر بیشتر مدارس میں آچکی ہے، اس صدقہ ءجاریہ کا بڑا حصہ، استاذ گرامی حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی علیہ الرحمہ کے، روشن نامہءِ مبارک کی بہترین یادگار ہے۔

الداعی۔۔۔۔۔۔۔ مآثر دیوبند کا باتوفیق نامہ بر

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری
(امیر خسرو)

صحافت، شاہِ جہاں ہے، انسانی انبوہ، یومیہ فکری وذہنی خوراک کے لیے، صحافتی آستانوں کا نیاز مند ہوتا ہے، ذرائع ابلاغ کے تنوع نے، خواندگی کی شرط بھی اٹھادی ہے؛ بل کہ مرئی صحافت نے خواندوں کو بھی فتح کرلیا ہے، فارسی واردو کے برعکس، عربی زبان ہمارے معاشرے میں، روزمرہ کی گفتگو کا حصہ کبھی نہیں تھی؛ اس لیے عربی صحافت حاشیے پر رہی؛ برصغیر

میں عربی صحافت، اپنے سرگرم سفر میں، دیگر اغراض ومقاصد کی احسان مند پائی گئی۔

دعوت وارشاد، علم وتحقیق، زبان وادب، عالم عربی سے رابطہ کاری؛ جیسے مقاصد کے تحت دینی مدارس سے نکلنے والے رسائل نے، بلاد ہند میں عربی صحافت کو زندہ رکھا، مرکزی اداروں نے اپنے عربی ترجمان بہت اہتمام سے شائع کیے، درس وتدریس کی طرح، اس باب میں بھی از ہر ہند، سالارِ قافلہ تھا، مادر علمی میں عربی زبان کا پرچم، وحید العصر، حضرت مولانا وحیدالزمان رحمہ اللہ نے بلند کیا تھا، ایک زندہ اور اظہار خیال کی تازہ زبان کے طور پر، ہمارے احاطے میں، اس کا تعارف کرانے والے آپ ہی ہیں؛ اپنی محبوب زبان کی ترویج کے لیے، حضرت والا نے متعدد ومتنوع خاکے مرتب کیے، اس حوالے سے آپ کا ترکش تیروں سے معمور تھا، اس سنہرے سلسلے کو تحریر کی بیش قیمت کڑیوں نے زینت دی، اندرون احاطہ نکلنے والے دیواری پرچوں کی داستان دراز ہے، بیرونی دنیا سے ہم کلامی کا آغاز 1965ء میں رسالہ ''دعوۃ الحق'' سے کیا، جس نے اپنی عمر کی دس بہاریں دیکھیں اور 1975ء میں موقوف ہوگیا۔

پھر ایک مختصر وقفے کے بعد، اس کی جگہ، ایک ایسے نئے رسالے نے لی؛ جس کے لیے سعادت وتوفیق کی نئی داستان مقدر تھی، جس کی شہرت کائنات کی وسعتوں کو طے کرنے والی تھی، جس کا فیض عرب وعجم؛ دونوں کو اپنے دائرے میں لینے والا تھا، جو دارالعلوم دیوبند کے متاعِ فخر میں، بیش قیمت اضافہ کرنے والے تھا، جو مادرعلمی کا مستند وثقہ ترجمان بننے والا تھا۔

اس گل شن کے برگ وبار، حضرت مولانا وحیدالزماں علیہ الرحمہ سے بھی منسوب ہو سکتے ہیں؛ کیوں کہ وہ اس کے بانی تھے؛ اس کے حسن کا کچھ حصہ، مدیر دوم، حضرت مولانا بدرالحسن قاسمی دامت برکاتہم کی بھی یاد تازہ کرتا ہے کہ وہ بھی اپنے استاذ کے نقش قدم پر تھے؛ لیکن 1975ء کی نوزائدگی سے، 2021ء کے شباب تک کا سفر، جس جاں کاہی کی داستان سے عبارت ہے، وہ اس کے عاشق شیدا، عربی زبان کے محب صادق، مادر علمی کے سب سے مضبوط ترجمان، استاذِ گرامی، حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی علیہ الرحمہ کا نذرانہء حیات ہے۔

اسی کی دہائی کے شروع میں، عام کاغذ پر، سادہ ہیئت اور معمولی پیرہن کے ساتھ شائع ہونے والا یہ پندرہ روزہ مجلہ، زبان، ادب، فکر، تخلیق اور صحافت کے حوالوں سے بھی خاص امتیاز کا حامل نہیں تھا، اس کو معاصر عربی رسائل کی دوڑ میں شامل کرنے کے لیے، استاذ گرامی نے، خون جگر سے سمجھوتہ کیا، اس کی ترقی کے سفر میں حضرت کا شباب اور اس کی رعنائیاں، صحت اور اس کے راحتیں، توانائی اور اس کی طالع آزمائیاں، بہار حیات اور اس کے نسیم وصبا، حرکت وعمل اور ان کا شور وفغاں، امتحان زندگی اور اس کے نشیب وفراز، متاع وقت اور مشاغل علم وعمل؛ غرض! خرمن زیست بلاکم وکاست کام آیا؛ تا آں کہ وہ وقت بھی آیا، جب الداعی اور وہ ایک دوسرے کا تعارف اور شناخت بن گئے، الداعی ان کے بغیر اور وہ الداعی کے بغیر متصور نہیں تھے۔

اپنی افتاد میں وہ سفر سے متوحش تھے، ملک بھر سے مرکزی اداروں کے موقر دعوت نامے آستانے پر ہجوم کرتے تھے؛ لیکن اسی عذر طبع کی وجہ سے شرف قبولیت سے محروم رہتے تھے؛ مگر ایک سفر اس عذر سے مستثنیٰ رہا، مجلہ الداعی کے حسن ومعیار کی راہ کے بڑے بڑے خواب، ان کو ہر ماہ پرانی دہلی کی تنگ وتاریک گلیوں میں پہنچادیتے تھے، عناوین کے کاتبوں، سرناموں کے تزئین کاروں، جلدسازوں، پریس کے مالکوں، کاغذ کے تاجروں وغیرہ سے، عہدہ برآ ہونے کے لیے، وہ خود قدم رنجہ فرماتے تھے، الداعی کی زینت کے لیے، انھوں نے اپنے اس اصول کو خود پر سختی سے نافذ کیا کہ اگر کسی کام کو عمدگی سے کرنا چاہتے ہو، تو اسے خود کرو۔

ظاہری حسن کے علاوہ، معنوی خوبیوں کا خاص اہتمام کیا، مشمولات میں تنوع اختیار کیا، علم وادب کے علاوہ، عام دینی واصلاحی، دعوتی وتاریخی، تہذیبی وسیاسی، ملکی وبین الاقوامی، معاشرتی وملی موضوعات کو جگہ دی، حضرت نے ''الداعی'' کو آٹھ کالموں میں تقسیم کیا تھا:

۱-کلمہ ٔمحرر؛ یہ مختصر اداریہ تھا، اس میں عموماً کوئی سلگتا ہوا موضوع زیر بحث ہوتا۔

۲-کلمہ ٔعدد؛ یہ اصل اداریہ تھا؛ جس میں آپ خاص اہمیت کے حامل موضوع کو منتخب

کرتے تھے اور قاری کی سیر چشمی کو لوٹ لیتے، اس کالم کی یہ دولت، دفاع اسلام، دعوت اسلامی، فکر اسلامی اور حق کی ترجمانی کی عظیم تاریخ رقم ہوئی، اسی کالم کی طاقت ور نگارشات نے، عالم عربی کے سامنے، دارالعلوم دیوبند کی عظیم، دینی، علمی، فکری، اصلاحی اور دعوتی خدمات اور دفاع اسلام کی راہ میں ان کی درخشاں داستانِ جہاد و حریت کا خوب صورت اور بھرپور آئینہ پیش کیا، انھوں نے دارالعلوم، اکابر دارالعلوم اور فکرِ دارالعلوم پر متواتر و پیہم لکھا؛ تا آں کہ الداعی پورے معانی میں، ترجمان دارالعلوم بن گیا۔

۳-اشراقہ: یہ اپنی نوعیت کا منفرد اور یگانۂ روزگار کالم تھا، اس کو آپ کی ادبی، فکری اور تخلیقی جوہر کا آئینہ سمجھنا چاہیے، ان کے نزدیک رہنے والے، اگر اس کو پڑھتے، تو محسوس ہوتا کہ وہ براہ راست ہم کلام ہیں، جو معاشرتی و فکری موضوعات ان کے ذہن کی تازہ گردش کا حصہ ہوتے، وہی اشراقہ کی صورت اختیار کر لیتے تھے، ان کی مجلس کی تمام تر دل چسپیاں، ان کے اشراقہ میں سمو جاتی تھیں، جس نے حضرت کی طباعی، خوش مزاجی، نکتہ سنجی، ظرافت اور پُرلطف چھیڑ چھاڑ نہیں دیکھی ہے، وہ اشراقہ پڑھ کر محرومی دور کر سکتا ہے، وہ ان کے سیال ذہن کا یادگار فیض ہے، حضرت علیہ الرحمہ، وفات سے قبل، اس کالم کے مجموعے کو، کتابی شکل دے گئے ہیں اور اس کام کی کرامت یہ ہے کہ اس کا نام ''من وحي الخاطر'' رکھا، جو مندرجات کا بھرپور ترجمان ہے۔

ان تین مستقل کالموں کے علاوہ، حضرت کے تراجم بھی متواتر شامل اشاعت رہتے تھے، اس ضمن میں حضرت نے اکابر کی بیش قیمت اردو کتابوں کو عربی قالب سے روشناس کرایا، یہ حضرت کی طرف سے دیوبند کی، بافیض مقدس ہستیوں کے لیے بہترین خراج عقیدت ہے، جس کی ابدی داد لینے کے لیے، اب وہ ان کے جلو میں پہنچ گئے ہیں، ذوق کے علاوہ اکابر کے تئیں، حضرت کا یہ عشق تھا، جس نے ان سے، تراجم کے سلسلے کا کام، اتنے بڑے پیمانے پر لیا۔

''الداعی'' کے دیگر سات کالم درج ذیل تھے:

الفكر الإسلامي، دراسات إسلامية، الأدب الإسلامي، إلى رحمة الله،

العالم الإسلامي، محليات، أنباء الجامعة،ان میں سے بعض کالم، عالم عرب کے ممتاز اصحاب علم وادب کے لیے محفوظ تھے، بعض دیگر اساتذۂ دارالعلوم کی علمی، ادبی اور لسانی کاوشوں سے منسوب ہوتے، کبھی آپ کا قلم ان باقی ماندہ کالموں کو بھی سیراب کرتا، کبھی تخصص فی الادب کے طلبہ کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی، راقم سطور کو بھی تخصص فی الادب کے سال، یہ لطف وعنایت حاصل رہی، متعدد شماروں میں میری ناقص تحریریں بھی شامل اشاعت ہوئیں۔

حرفِ شیریں

مر بھی جاؤں تو کیا لوگ بھلا ہی دیں گے
لفظ میرے، میرے ہونے کی گواہی دیں گے

درس، ہزار خوبیوں کا سر رشتہ ہے، علمی ترقیاں ہمارے فاضل کو، ہشت پہلو شخصیت میں تبدیل کر دیتی ہیں، فیض کا تنوع مختلف میدانوں کا فاتح بنا دیتا ہے؛ لیکن شخصیت کا نزدیکی تجزیہ واضح کرتا ہے کہ بیشتر کمالات کی تخلیق، مشغلہءتدریس کے بطن سے ہوئی ہے، واقعی درس وتدریس کی برکات بے پناہ ہیں، دروس کے نکات کا جوش واُبال، یکا یک شارح بنا دیتا ہے، نقول کا فرق اور وجہِ فرق کی جستجو، ایک محقق کی دریافت پر منتہی ہوتی ہے، اختلافی مباحث، ہمیں اجتہاد کے راہ نورد دیتے ہیں، فرق باطلہ کی کج حجتی کی کوکھ سے، مناظرین جنم لیتے ہیں، رقاق وزہد کے اسباق، مبلغین اور واعظین چھانٹ لیتے ہیں، غرض! ایک رشتہءتدریس ہے اور ہزار عناوین رہینِ احسان ہیں۔

لیکن اگر تدریسی فیض جمود آشنا ہو جائے؛ بیرونِ قفس پرواز کی راہیں دریافت نہ کرے، تو وہ وقتی حباب اور عارضی بلبلہ بن کر رہ جاتا ہے، مدرس اپنے فیوضِ خاطر کو ملکے میں نہ لے، یہ شکار سخت متوحش ہیں، لمحہءدیگر میں بدک کر دور نکل جاتے ہیں، قلم وقرطاس ہمہ وقت، آسان دست رس میں رہنے چاہئیں، آمد کے دریچے وا ہونے سے قبل اشارے نہیں دیتے۔

حضرت الاستاذ مولانا نور عالم خلیل امینی علیہ الرحمہ کا یہ فیصلہ حیات بخش اور بابرکت ثابت ہوا کہ وہ مدرسہ شاہی مرادآباد کے پروگرام کی، مبسوط تقریر کو کتابی شکل دیں، حرفِ شیریں، انھیں شذرات کی جھلک ہے، جو آپ تکمیل ادب میں دہائیوں سے بکھیرتے آئے

ہیں، مدارس میں گذشتہ دو دہائیوں میں جو خوش گوار تبدیلیاں آئی ہیں، وہ حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ سے بہ وجوہ منسوب ہیں: ۱- مختارات میں تو وہ انگلی پکڑ کر چلنا سکھاتے ہی تھے، ۲- دوم، فیض یافتہ فضلا کی جدید کھیپ نے، اس مشن کو آگے بڑھایا، ۳- تیسرا حوالہ، نگینوں سے مزین یہ مرقع ہے، جسے حرف شیریں سے یاد کیا گیا۔

تحریر میں آپ کے یہاں وہی طرز وادا جلوہ افروز ہے، جو آپ کی تدریس کی شناخت رہی، تحریری تدقیق وتعمق، جس کا ایک جہاں مدح سرا ہے، اسی جذبے کا پرتو ہے، جو دوران تدریس نمایاں رہتا تھا، افادات کی ترسیل کا سودا، ہر نوع کی قنوطیت کے لیے پیغام موت تھا، تہی دامنی کا عہد رکھنے والوں کو بھی، آپ حیات بخش تلخ نسخے، گھوٹ گھوٹ کر پلاتے تھے، صحت کے عوارض کے ساتھ، تدریس کی توانائی، کرامت سے کم نہ تھی؛ گویا ہر ذرے کو ستارہ بنانے کا حلف اٹھایا ہوا تھا، کسی کی بے دلی، آپ کے ولولے کو سرد نہیں کر سکتی تھی، آپ کے سوز وساز کی ترجمانی کسی نے خوب کی ہے:

فغان جاں گسل رکھتا ہوں لیکن
نہیں سنتا میرا صیاد میری

حرف شیریں کا اجمالی تعارف، خود حضرت والا کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

''عربی زبان وادب کی ایک بزم میں کی گئی، ایک اہم اور دراز نفس تقریر؛ جس میں عربی زبان کی اہمیت، اس کو تحریراً وتقریراً سیکھنے کے طریقوں، جملہ نگاری سے مضمون نگاری تک کی منزلوں، عربی کو عربوں کے لہجے میں بولنے کی تدبیروں، خوش خطی کے فوائد، بد خطی کے نقصانات، تحریر کی مختلف شکلوں کے حوالے سے، علمائے نفسیات کے اخذ کردہ نتیجوں، عربی اور اردو میں عصر حاضر میں استعمال کردہ رموزِ اوقاف، عربی میں ہمزے کی کتابت کے ضروری قواعد وامثال، عربی عبارت کو صرفی ونحوی غلطی سے پاک کرنے کی راہوں کی دل چسپ، پر لطف اور برجستہ انداز میں نشان دہی کی گئی ہے، اس میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ زبان وادب کے تمام شائقین کے لیے ایک تحفہ، پیغام اور ناگزیر ضرورت ہے۔'' (مقدمہ حرفِ شیریں)۔

اس ہدایت نامے کی خاص بات یہ ہے کہ یہ مبتدی کا ہاتھ پکڑتا ہے اور اسے محرم اسرار بنا کر چھوڑتا ہے، اس میں زبان وادب کی بسم اللہ بھی ہے اور سندِ فضیلت بھی، جملہ سازی سے شروع ہونے والا سفر، مضمون اور رسالے پر ختم ہوا ہے، ضروریات کے ساتھ آداب بھی سکھائے ہیں، محرمات کے ساتھ مکروہات سے بھی بچایا ہے، کتاب کا مطالعہ، تکمیل ادب کی درس گاہ میں پہنچا دیتا ہے؛ یہ کتاب آپ کے نصابِ اتالیقی کا بہترین نمونہ ہے۔

لیکن اسے ''مشتے نمونہ از خروارے'' ہی سمجھنا چاہیے؛ کیوں کہ اولاً تو اس سے زائد تفصیل، کسی پروگرام کی برجستہ تقریر میں ممکن نہیں؛ دوسرے خلاق طبیعتوں کی ایجادات کا سفر، پیہم سرگرم رہتا ہے؛ آپ کے یہاں، تعلیم وتربیت کے نئے ابواب ہر روز مفتوح ہوتے تھے، تعلیم کی نفسیات کے وہ بادشاہ تھے، ان کی تخلیقی طبیعت، ہر آن نئے منطقوں کا سفر کرتی تھی، ان کے پیدا کردہ انوکھے زاویے، دشتِ امکان کی سیر میں ہمہ وقت سرگرم رہتے تھے؛ ایسی منفرد وطباع شخصیت کی دریافتوں وفتوحات کی تعبیر کے لیے، محض سو صفحات پر مشتمل، ایک مختصر رسالہ کب کفایت کرسکتا ہے!۔

''پسِ مرگ زندہ''۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ترجمان التراجم

اشرار کے انبوہ میں یہ خالدؓ وحیدرؓ
ابرار کی محفل میں غلام شہِ ابرار
(مائل ملیح آبادی)

خاکہ نویسی، سوانح نگاری، تاثراتی نگارشات، شخصیات کی تصویر کشی؛ یہ فن استاذ گرامی، حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی علیہ الرحمہ کی علمی وفکری شخصیت کا بنیادی عنصر ہے، ''وہ کوہ کن کی بات'' سے، اردو زبان وادب کے گل شن میں، آپ کی سحر انگیز آمد نے سب کو چونکا دیا تھا، پھر آپ نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، یکے بعد دیگرے، سوانحی نقوش کے انبار لگا دیے، اس میں شک نہیں کہ آپ کے قلم نے، جتنے کردار منتخب کیے، وہ یکتائے روزگار تھے؛ لیکن آپ کی سلیقہ مند نقاشی نے، ان کے حسن کو مزید نکھارا، ''پس مرگ زندہ'' کتاب نہیں، آبِ حیات ہے، وہ بھی دو مختلف سمتوں میں بہنے والا: ایک جانب کاروانِ رفتہ کو حیات بخشا

ہے،تو دوسری جانب آئندگان کوفیض کا ابدی چشمہ فراہم کرتا ہے۔

سیر وسوانح کا میدان وسیع بھی ہے اور شاداب بھی؛لیکن بیشتر سوانحی شاہ کاروں کا المیہ یہ ہے کہ وہ غیر مشاہد قلم کے رہین احسان ہیں؛ جب کہ ''شنیدہ کے بود مانند دیدہ!'' یہی وجہ ہے کہ جو سوانح عمریاں، معاصرین عباقرہ نے لکھی ہیں، وہ لاجواب ہیں، حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کے جمال وکمال کے تدوین کاروں میں، وقت کے ممتاز اہل قلم شامل رہے ہیں اور یہ کارواں ہنوز رواں دواں ہے؛لیکن جو بات چند صفحاتی ''سوانح قاسمی قدیم'' میں ہے ، وہ بعد کے ضخیم دواوین میں نہیں؛ کیوں کہ ''سوانح قاسمی قدیم'' کے جمع کار، حضرت علامہ یعقوب نانوتوی علیہ الرحمہ، صدر مدرس دارالعلوم دیوبند تھے، جنھوں نے وہ کمالات واوصاف بہ چشم خود ملاحظہ کیے تھے۔

اسی لیے کہتے ہیں کہ بڑی شخصیات کے رخصت ہونے پر، احباب وخدام کو، اپنے مشاہدات وتاثرات قلم بند کرنے میں، لیت ولعل سے کام نہیں لینا چاہیے، قطب عالم حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ کی وفات پر، خادم خاص اور نابغہء روزگار، حضرت مولانا یحیی علیہ الرحمہ کی جانب نگاہیں اٹھی تھیں؛ تا کہ الطافِ عام کے علاوہ، وہ جلوے بھی سامنے آئیں، جن کے مشاہدے کی سعادت میں وہ منفرد تھے؛ ان کو ہر چہار سو اسی التماس کا سامنا تھا؛لیکن بروقت وہ یہ فیصلہ نہ لے سکے؛ اس میں شک نہیں کہ ''تذکرۃ الرشید'' کا گلشن، علامہ عاشق الٰہی میرٹھی علیہ الرحمہ نے، اپنے خون جگر سے سینچا ہے اور یہ بھی حق ہے کہ استناد، ثقاہت، جامعیت اور کمال نقاشی میں، وہ سوانح عمری کے باب کا نگینہ ہے؛لیکن اگر قلم حضرت مولانا یحییٰؒ کے ہاتھ میں ہوتا، تو لوح وقرطاس کا رنگ وآہنگ بالیقین بہت مختلف ہوتا۔

''پس مرگ زندہ'' کے حسن کو یہی چیز دوبالا کرتی ہے؛ کیوں کہ اس میں جتنے نقوش ثبت ہیں، وہ سب تجربات ومشاہدات کی دین ہیں، حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ نے، انھیں شخصیات کو موضوع بنایا، جن کو نزدیکی سے دیکھنے اور برتنے کا موقع ہوا تھا، چوں کہ بیشتر نقوش، رشتہء عقیدت کے رہین احسان ہیں؛ اس لیے تراجم بھی دل وجان سے لکھے گئے ہیں۔

زندہ دلی، آزاد ذہانت اور متجسس دماغ نے، آپ کو غیر معمولی سوانح نگار بنایا، تدقیق

وتحقیق آپ کے تراجم کا امتیاز ہے، یہی وجہ ہے کہ اہم ترین شخصیات پر آپ کی تحریریں، تاخیر سے سامنے آتی تھیں، تحقیق ومراجعت کا سلسلہ دراز ہوتا تھا، متوفی کے اہل خانہ، خدام، متعلقین اور متوسلین سے، بہ تکرار رجوع فرماتے تھے، تنقیح طلب جزئیات کو بھرپور وقت دیتے تھے، استاذِ گرامی، حضرت مولانا ریاست علی بجنوری علیہ الرحمہ پر لکھنے سے قبل، مجھ سے کئی باتیں دریافت کیں، ایضاح البخاری کے کام میں، میری معاونت سے متعلق تفصیلی استفسار فرمایا، اسی طرح ''خلاصۃ التفاسیر'' کے کام کی نوعیت بھی تحریری شکل میں طلب فرمائی اور ان تفصیلات کو اپنے مقالے میں جگہ بھی دی۔

سوانح نگار پر مداحی ومبالغہ آمیزی کی تہمت ایک روایت ہے؛ یہ تخلیق کار کی مجبوری بھی ہے؛ کیوں کہ شخصیت کے انتخاب میں قلم کار کا ذاتی تاثر کلیدی کردار نبھاتا ہے؛ جس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذاتی خیالات، قدم قدم پر حقائق سے مزاحم ہوتے ہیں، شخصی پسند اور ناپسند، قلم کا رخ طے کرتی ہے، ایسی صورت میں کم زور طبیعت کے قلم، مبالغہ آمیزی میں، منزلوں آگے نکل جاتے ہیں اور اس طرح فرضی کمالات کے مجموعے مرتب ہوجاتے ہیں۔

آپ سوانح نگاری کے اس امتحان میں سرخ رو ہیں، ''پس مرگ زندہ''، شخصیات کی تصویرکشی میں افراط وتفریط سے منزہ ہے، اکابر کی کہکشاں میں ہر ستارہ اسی جگہ ہے، جہاں میزانِ عمل کی پرواز نے اجازت دی ہے، معلوم ہے کہ بیشتر کمالات؛ بڑوں کی سیرت کا قدرمشترک ہے؛ تخلیق کار کا کمال یہ ہے کہ وہ وجوہِ امتیاز کو سامنے لائے۔

حضرت کے تراجم اس جوہر کی نمود سے آراستہ ومزین ہیں؛ چناں چہ حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ، ان کے یہاں ممتاز مؤرخ وسوانح نگار ہیں، حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیبؒ، وقت کے رازی وغزالی ہیں، حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ، میر کارواں ہیں، حضرت مولانا وحید الزماںؒ، عبقری معلم ہیں، حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ، کو وہ فقہ وفتاوی کی آخری کڑی کہتے ہیں، حضرت مولانا منظور نعمانیؒ، ان کے نزدیک ہمہ جہت خادم دین ہیں، حضرت قاری صدیق باندویؒ، مجسم مقبولیت ومحبوبیت ہیں، حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ، کو وہ خاص فقہ قضا کے لیے ڈھلے ہوئے ذہن کے طور پر یاد کرتے ہیں،

حضرت مولانا ابرار الحق ہردوئیؒ ان کے نزدیک داعیانِ حق کی زنجیر کا آخری حلقہ ہیں، حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ کو، انھوں نے مردِ آہن کے طور پر یاد کیا ہے؛ غرض! شخصیت کے تمام گوشوں کا جائزہ لینے کے بعد، خاص اس عنصر کو دریافت کرتے ہیں، جو شخصیت سازی کا بنیادی جز و ہو؛ اس طرح وہ نچوڑ و عطر نکالنے میں بھی، قاری کے منت کش نہیں ہوتے۔

سوانح نگاری میں، آپ کی عبقریت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ ''پس مرگ زندہ'' میں، حضرت مولانا وحید الزماں علیہ الرحمہ سے متعلق دو مضامین ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں؛ اس میں دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ آپ، حضرت مولانا کیرانوی علیہ الرحمہ سے متعلق ایک مستقل اور مبسوط کتاب لکھ چکے تھے اور ان دونوں نئے مضامین میں، اس کتاب سے کوئی بات نہیں لی گئی؛ گویا یہ تینوں تحریریں مستقل ہیں اور ہر سہ کاوشیں، تکرار و اعادے سے مبرا ہیں، ان کے علاوہ بھی اسی نوع کی متعدد شخصیات ہیں، جن کو ایک سے زائد مقالات میں خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے سے بالکلیہ غیر متعلق ہیں۔

حضرت الاستاذ کے تراجم کی کثرت و تنوع، گہرائی و گیرائی، مختلف الجہات تجزیے، خارجی شخصیت پر منطبق ہوتی سچی تصویر کشی، نوع بہ نوع شخصیات کا انتخاب اور ان کے مختلف پہلوؤں کا بھرپور احاطہ؛ جیسی درجنوں خوبیاں آپ کو اس عہد کے عظیم ترجمہ نگار کا رتبہ دلاتی ہیں، اس ضمن میں آپ نے جو اثاثہ چھوڑا ہے، وہ نسلوں کی تربیت اور ان کی علمی و فکری آب یاری کا شان دار عنوان ہے۔

فلسطین۔۔۔۔۔۔۔۔

غمزۂ جذب و کشش، عشوۂ غیرت و ناموس، وجہِ گریۂ خونیں

اتنا سادہ نہ بن تجھ کو معلوم ہے
کون گھیرے ہوئے ہے فلسطین کو
(حبیب جالب)

ادب وانشا اور زبان وسخن کے جلووں میں، استاذِ گرامی، حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی علیہ الرحمہ کی، ہمہ جہت شخصیت کے کئی پہلو نمایاں ہوتے ہیں، وہ اسلامی اور ملی مسائل میں، حد درجہ حساس طبیعت کے مالک تھے، سقوطِ طالبان کے بعد انھوں نے فرمایا تھا کہ میری تخلیقی صلاحیت کند اور پژمردہ ہوگئی، ملت کے داخلی وخارجی مصالح کا ان کو گہرا ادراک تھا، ''جانِ پرسوز'' ملی نشیب وفراز سے ہلکان تھی، صحافتی مصروفیت نے بھی، اس آتش کی شدت وحدت میں اپنا حصہ شامل کیا تھا۔

مسئلۂ فلسطین، ملت اسلامیہ کے لیے، جدید دور کا سب سے بڑا زخم ہے، گذشتہ ستر سال کا طویل دورانیہ، اس کو بھرنے میں ناکام رہا ہے، آیندہ ستر سال کا وقت بھی اس کا مرہم نہیں ہوسکتا، وہ مجرد خطہ ارض نہیں؛ بل کہ قبلۂ اول ہے، خود صاحبِ نبوت نے، اس ارض پر جبہہ سائی کی ہے، قدمِ محمدی نے، اس کی عزت کو عروج بخشا ہے، وہ ہمارے لیے تیسرا حرم ہے، قرآن اس کی برکتوں کے حوالے دیتا ہے، وہ اہل ایماں کا مرکزِ جذب وکشش اور محورِ غیرت وناموس ہے۔

حضرت مولانا علیہ الرحمہ نے، ماہ نامہ ''الداعی'' کے طویل ادارتی دور میں، متنوع موضوعات کو، اپنے شاداب قلم کے فیض سے گراں بار کیا، دینی، ملی، سیاسی، سماجی، اصلاحی، دعوتی؛ غرض! کوئی موضوع ایسا نہیں، جو آپ کی علمی وفکری تسخیر کی برکتوں سے محروم رہا ہو؛ لیکن مسئلہ فلسطین کو اس میں خاص رتبہ حاصل ہے، اس موضوع پر آپ کی طبیعت غیر معمولی طور پر کھلی ہے، فلسطین پر آپ کا قلم، اسلام اور اس کے مقدسات کے عشق میں ڈوبا ہوا ہے، اس موضوع پر آپ دوسرے علی میاں ندویؒ نظر آتے ہیں، ان کی طرح آپ نے بھی، اس حوالے سے عربوں کی فکر کو متنبہ کیا، اسے عرب کی تنگ حمیت سے نکال کر، اسلام کی وسیع غیرت سے متعارف کرایا، ان کی تحریروں میں ایک بلبل ہے؛ جو قدس کی نوحہ گری میں، ملت اسلامیہ کی ترجمانی کرتی ہے۔

ارض مبارک کے مسئلے پر آپ کی تحریریں، جامعیت، فنی کمال، موضوع کی سیرابی، دور افتادہ گوشوں کی آسودگی، جزئیات کی تنقیح وتفصیل وغیرہ میں اپنی نظیر خود ہیں؛ بہت

مشکل ہے کہ کسی نے قدس پر، اتنا جامع ومکمل تحریری سرمایہ چھوڑا ہو، وہ سرزمین مقدس کے جغرافیے کو بیان کرتے ہیں، تو اس کی واقعی حدود کی نشاندہی میں، تعمق وتدقیق کی تعبیرات کو پھیکا کر دیتے ہیں، اس کے مادی وسائل کو کھولتے ہیں، تو وہ قدرتی چشموں وذخائر میں رشکِ عالم نظر آتی ہے، تاریخی اوراق الٹتے ہیں تو بہت دور نکل جاتے ہیں، ظلم کی تازہ داستان چھیڑتے ہیں، تو کلیم عاجز کے اشعار، شرم سار نظر آتے ہیں، ان کے تحریریں، 1947ء، 1996ء، 2008ء، 2014ء کے قتل عام کی مستند ومفصل دستاویز ہیں۔

فلسطین میں انھوں نے اسلام کو مقدم رکھا ہے؛ چناں چہ اس شاہ کار میں، وہ مفکر وادیب سے زیادہ، محدث ومفسر ہیں، موضوع کی جزئیات کو قرآن وسنت کے شواہد سے معمور کر دیا ہے، زمین، اہل زمین، مقدسات، برسرپیکار کاروانِ اہل عزیمت؛ غرض! ہر کردار کی شان میں، وارد نصوص کو سلیقے اور خوبی سے جمع کر دیا ہے، ان کا فلسطینی دیوان، اپنے موضوع پر اسلامیات کا انسائیکلوپیڈیا ہے، سطر سطر میں رگِ اسلام شعلہ زن ہے، ان کا قلم مجاہد تھا، جو پیغامِ احساس پر قناعت نہیں کر سکتا تھا؛ انھوں نے اسلامی وابستگی کے علانیہ اظہار کے ساتھ، آستین چڑھائی تھی۔

فلسطین میں مغربی ڈرامے کو، انھوں نے سبق اور درس کی طرح پڑھا تھا، وہ متون کی لکیروں کے فقیر نہیں تھے؛ بل کہ حواشی اور بین السطور کے محرم تھے، مذاکرات کی خوب صورت میزیں، شرم الشیخ کی دل ربائیاں، کیمپ ڈیوڈ کے اعزازات، ان کی نگاہِ حق بیں میں، کبھی وقعت نہیں پا سکے، فتح اور حماس کی جداگانہ راہوں میں سے، ایک کا انتخاب، ان کے لیے کبھی مسئلہ نہیں بنا، 2006ء میں حماس کی انتخابی فتح کا جشن منانے والوں میں، آپ کا قلم حق پرست پیش پیش تھا، وہ اس اصول کے ترجمان تھے کہ جو حق بے زور بازو غصب ہوا ہے، اس کی واپسی قوت بازو کے بغیر ممکن نہیں، راہِ پُرخطر کے سوا، تمام راہیں کھڈوں میں گراتی ہیں اور ان کھڈوں کو دلدل میں تبدیل بھی کرتی ہیں۔

''فلسطین کسی صلاح الدین کے انتظار میں''، اس کتاب کے مضامین عربی الاصل ہیں، اس کی تفاصیل کی آمد؛ عربی پیرہن میں ہوئی، افادۂ عام کے لیے اردو قالب سے آشنا

کیا گیا؛ گویا راست مخاطب عرب ہیں اور بالواسطہ ملت اسلامیہ اوراس کے غیور وحریت پسند فرزندان، حضرت علیہ الرحمہ نے، اس خطاب کے توسط سے، رنگ، زبان اورتہذیب کے اختلافات، نیز جغرافیائی دوریوں کو ہزیمت دے کر، فلسطین کو امت مسلمہ کے قضیے کے طور پر نمایاں کیا ہے؛ حضرت الاستاذ کی روح کو ہمیشہ یہ کامرانی آسودگی دیتی رہے گی کہ ان کے پیغام نے، اپنے اصل مخاطبین کو بھی خوب خوب فتح کیا ہے؛ چناں چہ آج وہاں کے راہ گیر ہوں یا ایوان پناہ؛ سب اسی صدا کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں، قراردادوں کی بھول بھلیوں سے سب ہاتھ جھاڑ چکے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ فلسطینی نگارشات کا یہ مجموعہ، ایک خوب صورت وقیمتی ادبی، دینی اور تاریخی مرقع ہے۔

خاتمہ

''مہلتِ کم''۔جس کو ہم نے عمر کا نام دیا ہے۔کی نیرنگی ملاحظہ ہو کہ باغِ قدس کی ویرانی کا تاریخ ساز نوحہ خواں اوراس کی بازیابی کی تحریک کا سب سے بڑا نواسرا؛ جب عمر عزیز کے آخری سانس لے رہا تھا، تو اس مقدس سرزمین پر، ایک نئی صبح طلوع ہونے والی تھی، جس کو دیکھنے کے لیے ان کی انمول زندگی نے، خواب سجائے تھے اور عمر بھر آہِ سحر گاہی کو آباد کیا تھا، حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ کی وفات 3 مئی کو ہوئی؛ جب کہ فلسطین کی حالیہ رزم کا دورانیہ، 10 مئی سے، 21 مئی کے درمیان ہے؛ گویا رب کائنات نے، ان کی نوائے زیست کو، شرف قبولیت سے نوازنے کے لیے اپنے پاس بلایا؛ اہل نظر کا تجزیہ یہی ہے کہ غزہ کی مذکورہ، مزاحمت وثابت قدمی میں، آیندہ کل کی مکمل فتح بھی جھانک رہی ہے۔

القصہ! حضرت والا اب ہمارے درمیان نہیں رہے؛ لیکن ان کے نقوشِ سینہ وسفینہ، ہمیشہ درخشاں وتابندہ رہیں گے، وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوئے ہیں؛ لیکن ہمارے احساس میں، ان کا سراپا، زندہ وروشن رہے گا:

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

یہ سطورِ پراگندہ، سوانح کی تعبیر سے فروتر ہیں، ان کو تاثرات سے زائد سمجھنا بے محل

ہوگا؛ میرے لیے یہی تصور، اثاثہ ہے کہ ان مشاہدات کی ترتیب نے، حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ کی یادوں میں، کچھ وقت گزارنے کا بہانہ فراہم کیا۔

اللہ تعالی حضرت علیہ الرحمہ کی باقیات کو بہترین صدقہء جاریہ بنائے، آپ کو جنت الفردوس کے مکینوں میں شامل فرمائے، قربِ خاص عطا فرمائے، انبیاء کرام، صدیقین، صالحین، شہدا اور جملہ خدام دین کے مابین سرخ رو فرمائے، آمین، **وصلی اللہ تعالی، وسلم، علی خیر خلقہ، محمد و علی آلہ، و صحبہ أجمعین۔**

18 ذی قعدہ، 1442ھ

28 جون 2021ء

مختصر سوانحی خاکہ

ماخوذ و مستفاد از مضامین مختلفہ

نام ونسب

نور عالم خلیل امینی، والد گرامی کا نام حافظ خلیل احمد ہے اور سلسلہء نسب اس طرح ہے:
نور عالم، بن خلیل احمد، بن رشید احمد، بن محمد فاضل، بن کرامت علی صدیقی۔

امینی، آپ کی علمی نسبت ہے کہ آپ کی فراغت مدرسہ امینیہ دہلی سے تھی، آپ نے اس کا التزام اس درجہ کیا کہ نسبت بھی جز و نام کی طرح معروف ہوئی، کنیت ابواسامہ اختیار کی تھی اور آپ کے معرکۃ الآرا کالم ''اشراقہ'' نے، اس کو بھی لازوال شہرت سے ہم کنار کیا، اس عنوان کے لیے آپ نے یہ کنیت ہی مختص کی تھی۔

تاریخ پیدائش

۱۸ دسمبر ۱۹۵۲ء - یکم ربیع الآخر ۱۳۷۲ھ تاریخ ولادت ہے، آپ کا آبائی وطن رائے پور ضلع سیتامڑھی ہے؛ لیکن ولادت ہرپور بیشی میں ہوئی، جو آپ کی والدہ ماجدہ کا میکہ تھا۔

ابتدائی احوال

تین سال کی عمر تھی کہ سایہء پدری سے محروم ہوئے، والدہ کا نکاح ثانی ہوا؛ لیکن شوہر ثانی کی عمر نے بھی وفا نہ کی اور پینتیس سال کی عمر میں، دوبارہ بیوہ ہوئیں، آپ کی پرورش، والدہ اور نانا نے کی۔

تعلیم وتربیت

قاعدہ بغدادی نانا کے سامنے شروع کیا، پھر ابتدائی تعلیم کے لیے رائے پور کے مکتب

میں داخل ہوئے، محرم ۱۳۸۰ھ جون ۱۹۶۰ء میں، مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں شعبہء حفظ میں داخل ہوئے؛ لیکن حفظ کا سلسلہ سات پاروں پر موقوف ہوگیا اور ۱۳۸۱ھ ۱۹۶۱ء میں درجہء ششم اردو میں منتقل ہوگئے، مدرسہ امدادیہ میں، آپ نے مولانا اویس رائے پوری اور مولانا تسلیم قاسمی سدھولوی وغیرہ سے، اکتسابِ فیض کیا۔

۱۹۶۴ء ۱۳۸۳ھ کو، دارالعلوم مئو میں، سال اول عربی میں داخل ہوئے، یہاں آپ کے استاذہ میں، مولانا ریاست علی بحر آبادیؒ، مولانا امین ادرویؒ، مولانا نذیر احمد مئویؒ اور حضرت مولانا عبدالحق اعظمی علیہ الرحمہ، شیخ ثانی دارالعلوم دیوبند وغیرہ شامل ہیں۔

۱۳۸۷ھ ۱۹۶۷ء کو دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، یہاں حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ، حضرت مولانا محمد حسین بہاریؒ، حضرت مولانا معراج الحق دیوبندیؒ اور حضرت مولانا نصیر احمد خانؒ جیسے، عباقرہٴ وقت کے علوم ومعارف سے مستفیض ہوئے، فراغت مدرسہ امینیہ سے ہوئی، جہاں حضرت مولانا سید محمد میاں علیہ الرحمہ آپ کے خاص الخاص استاذ ہوئے۔

تدریس

فراغت کے بعد ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۲ء تک دارالعلوم ندوۃ العلما میں، برسر تدریس رہے، ۱۴۰۲ھ ۱۹۸۲ء کو، مادر علمی دارالعلوم دیوبند میں تقرر ہوا اور تدریس کے ساتھ، دارالعلوم کے عربی ترجمان ''الداعی'' کی ادارت بھی تفویض ہوئی اور یہاں کے چمنِ زبان وسخن کو تازیست سیراب کیا۔

عربی تصانیف وتراجم

۱-مجتمعاتنا المعاصرة والطريق إلى الإسلام ۲-المسلمون في الهند ۳-الدعوة الإسلامية بين الأمس واليوم، ۴-مفتاح العربية، (في جزئين)، ۵-العالم الهندي الفريد: الشيخ المقرئ محمد طيب، ۶-فلسطين في انتظار صلاح الدين، ۷-الصحابة ومكانتهم في الإسلام، ۸-من وحي الخاطر، (خمس مجلدات)۔

اردو تصانیف

۱- وہ کوہ کن کی بات، ۲- پس مرگ زندہ، ۳- فلسطین: کسی صلاح الدین کے انتظار میں، ۴- صحابہء رسول اسلام کی نظر میں، ۵- کیا اسلام پسپا ہو رہا ہے؟ ۶- عالم اسلام کے خلاف صلیبی صہیونی جنگ: حقائق اور دلائل، ۷- حرف شیریں ۸- خط رقعہ کیوں اور کیسے لکھیں؟ ۹- رفتگان نارفتہ۔

دیگر مصنّفین کی اردو تصانیف کے عربی تراجم

درج بالا فہرست میں، ان کتابوں کے نام شامل ہیں، جو آپ کی اپنی تصانیف ہیں، یا اپنی تصانیف کے تراجم ہیں، ان کے علاوہ، آپ نے دیگر اکابر اہل علم کی پچیس کتابوں کا، اردو سے عربی میں ترجمہ کیا ہے، جن میں بعض کے نام حسب ذیل ہیں:

۱- التفسير السياسي للإسلام، ۲- أحاديث صريحة في باكستان، ۳- الداعية الكبيرة الشيخ محمد إلياس الكاندهلوي، ۴- سيدنا معاوية رضي الله عنه في ضوء الوثائق الإسلامية، ۵- ماهي النصرانية؟ ۶- علماء ديوبند واتجاههم الديني ومزاجهم المذهبي، ۷- مأساة شاب هندوسي اعتنق الإسلام، ۸- الحالة التعليمية في الهند، فيما قبل عهد الاستعمار الإنجليزي وفيما بعده، ۹- الثورة الإيرانية في ضوء الإسلام، ۱۰- دعايات مكثفة ضد الشيخ محمد بن عبد الوهاب النجدي، ۱۱- الدعوة الإسلامية: قضايا ومشكلات، ۱۲- لآلي منثورة في التعبيرات الحكيمة عن قضايا الدين والأخلاق والاجتماع، ۱۳- الاشتراكية والإسلام، ۱۴- بحوث في الدعوة والفكر الإسلامي۔

کتابوں کے علاوہ آپ کے بافیض و باتوفیق قلم نے، عربی و اردو؛ ہر دو زبانوں میں پانچ سو مقالات و مضامین بھی، سپرد قرطاس کیے، جو برصغیر کے مختلف رسائل و اخبارات کی زینت بنے۔

علمی وادبی خدمات کا اعتراف وصدر جمہوریہ ایوارڈ

عربی زبان وادب کی وقیع خدمات کے لیے، آپ کو ملکِ عزیز کا موقر ایوارڈ، ''صدارتی سند اعزاز'' پیش کیا گیا، عربی زبان وادب کے میدان میں، آپ کے قلمی شاہ کار، قدیم الایام سے جادو جگا رہے تھے، عرب وعجم کے علمی حلقوں کی جانب سے، خراج عقیدت کا سلسلہ بھی دیرینہ تھا؛ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ اعزاز کے لیے، آپ کا نام نمایاں ہوا، تو خود اعزاز کو اعتبار وفخر حاصل ہوا۔

علالت اور وفات

شوگر کا مرض پرانا تھا، جو گردشِ ایام کے ساتھ، پیہم سنگین ہوتا گیا، چند سال قبل عارضہ قلب بھی پیش آیا، جس کے لیے آپریشن کرانا پڑا، صحت کے ان عوارض کی موجودگی میں، طبیعت کا عام نشیب وفراز بھی، موجب تشویش ہوتا ہے، کورونا کی دوسری لہر کے شباب میں، جب آپ کی بیماری کی خبر آئی، تو فکر دامن گیر ہوئی، اسپتالوں کے مخدوش کوائف کی وجہ سے، ابتدا میں علاج گھر پر ہی ہوا، وقت ضرورت مظفر نگر کی طبی سہولیات کو بھی آزمایا، آخرش صورت حال قابو سے باہر جاتی محسوس ہوئی، تو میرٹھ رجوع ہوئے؛ لیکن قضا وقدر غالب آئی اور ۳ مئی ۲۰۲۱ء کو، یہ آفتاب علم وادب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا، اسی روز بعد نماز ظہر، حضرت مولانا سید ارشد مدنی، صدر المدرسین دار العلوم دیوبند کی اقتدا میں، نماز جنازہ ادا کی گئی اور علم وادب کی اس امانت کو، مزار قاسمی کی مبارک خاک کے سپرد کر دیا گیا، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔